قاضی عبدالغفار

اردو مرکز۔ اردو بازار۔ دہلی

تعداد ۱۰۰۰
قیمت .... دو روپے

(بیری آرٹ پریس، دریا گنج دہلی)

ناشر
اردو مرکز ۔۔۔ اردو بازار دہلی

عجیب کلب

کسی زمانہ میں ــــ جب بے فکری کے مشاغل اگر پیدا نہ ہوتے تھے تو ایجاد کیے جاتے تھے ــــ یاروں نے ایک مخصوص کلب قائم کیا تھا، جو عرصہ تک ہم چند بے فکروں کا مشغلہ رہا۔ اس کلب میں صرف وہ لوگ شریک کیے جاتے تھے جو کم از کم ایک آپ بیتی، عجیب اور دلچسپ واردات بیان کر سکتے۔ قاعدہ یہ تھا کہ کلب کی رکنیت کا امیدوار اس قسم کی ایک داستان لکھ کر اپنی درخواست کے ساتھ پیش کرتا تھا اور اراکین کلب اگر اس داستان کو پسند کر لیتے تھے تو وہ داستان بطور فیس داخلہ قبول کر لی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں کلب کے دفتر میں ایسے بہت سے عجیب و غریب قصے جمع ہو گئے تھے۔ بعض ان میں سے ــــ

بوسیدہ اور پارینہ ــــ کلب کے پرانے کاغذات میں دستیاب ہو گئے۔ اکثر قدیم ممبروں کا پتہ نشان بھی اب معلوم نہیں ــــ خدا جانے زندہ ہیں یا مر گئے۔ لیکن بہرحال جن ممبران کی نظر سے یہ تحریر گذرے ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ اگر کچھ پرانے کلب والے قصے بھی انکو یاد ہوں تو بخل اور سہل انگاری

نگریں اور پرانے نقوش کو ایک دفعہ پھر اُجال دیں ــــ ان حضرات میں سے بہت سے تو غالباً ایسے ہوں گے جن کی جوانی کی یاد کو آٹھ دس بچّوں اور ایک دو بیوی نے مٹا ڈالا ہو گا کچھ ایسے بھی ہوں گے ــــ بدنصیب ــــ جن کے "زمانہ جاہلیت" کے نقوش کو زندگی کے مدوجزر نے فنا کر دیا ہو گا ــــ مگر کچھ تو ضرور ایسے ہوں گے جو بوڑھے ہو کر بھی ابھی ذرا جوان ہوں!! اوپر سے سُرخ اور تازہ سیب کی مانند کھال خشک ہو کر سکڑ گئی ہو گی، لیکن ظاہری زنگ و بُو سے محروم ہو کر بھی ممکن ہے کہ گودے کے اندر شاید کچھ رس باقی رہ گیا ہو!! ــــ میری طرح!! ــــ ان ہی جوان بوڑھوں کے دروازوں پر میں دستک دیتا ہوں۔ ہے کوئی "عجیب کلب" کا "ممبر" جواب بھی ابھی کوئی عجیب داستان پاستان ہمیں سنا دے؟ ــــ کوئی ایسی پھڑکتی ہوئی داستان جس میں زندگی کی حرارت ہنوز موجود ہو! ــــ ہے کوئی؟ مرحوم کلب کے دفتر پارینہ سے جو کچھ مل سکا وہ تو اس وقت حاضر ہے۔ اُن پرانے "عجیبوں" میں سے کسی "عجیب" نے اگر یہ آواز سن لی تو بہت سی داستانوں کی کڑیاں مل جائیں گی۔ بہرحال، فی الحال تو یہ اوراق حاضر ہیں ــــ

بہ یادِ رفتہ اراکینِ انجمنِ عجیب!

کھٹیا

یہ قصہ جناب صحرا نوردؔ نے
(اصل نام محفوظ ہے) اپنی درخواست
داخلہ کے ساتھ پیش کیا۔ اراکین
مجلس نے اس کو پسند کیا۔ لہٰذا
کلب کی اُرگینمنٹ کے لئے بطور
فیس داخلہ منظور کیا گیا۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں میری عمر ۲۳ سال کی تھی علی گڑھ کالج میں
ایف اے تک تعلیم پائی مگر میرا گھوڑا دو مرتبہ اس ٹٹی کو کودنے
میں ناکام رہا نتیجہ یہ ہوا کہ باباجان نے چھوٹے صاحب بڑے صاحب
ننھے صاحب کالے صاحب گورے صاحب غرضکہ ہر قسم کے صاحب
لوگوں سے سعی و سفارش کر کے مجھے ایک سرکاری صیغہ میں نمک خوا
سرکار بنا ہی دیا اپنے عہدے کے فرائض کی انجام دہی کے لئے
مجھ پر لازم تھا کہ شمالی ہندوستان کے ایک ایسے وحشت ناک
صحرائی اور پہاڑی حصے میں گھوڑے کی پیٹھ پر لدا ہوا مارا مارا
پھرا کروں جس کا کچھ حال اصل قصہ بیان کرنے سے پہلے سنا
دینا چاہیئے تاکہ پڑھنے والے میری داستان کے ماحول سے
کسی قدر آشنا ہو جائیں۔

شمالی ہندوستان میں ہمالہ کے سربلند سلسلہ کا دامن سینکڑوں
میل پھیلا ہوا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں میل لمبے چوڑے جنگل ہیں
— اس قدر گھنے کہ سورج کی روشنی بمشکل اُن کے اندر پہنچ
پاتی ہے — اور اس قدر مرطوب کہ گرم موسم کی جلتی ہوئی دوپہر
میں آپ یکایک اُس جنگل کے اندر داخل ہوں تو مارے سردی
کے کانپنے لگیں۔ خدا کی اُس زمین پر صادق کی ہلکی روشنی اور

گلابی جاڑوں کی سردی بارہ مہینے قایم رہتی ہو۔ سرکاری اصطلاح
میں دامنِ ہمالہ کے ان جنگلوں کو "ترائی" کہتے ہیں اور واقعی یہ اہم
صفت ہے بھی اُس جنگل کی و ۔ کا صحیح نام۔

اُس خطے کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قدرت نے وہاں اپنی نعمتوں
اور لعنتوں کو یک جا کر دیا ہے ــــ پہلو بہ پہلو ــ نہر اور نہ ہلڈ!
سرسبزی و شادابی، قدرتی مناظر کا حسن روح پرور حسین پرندوں
کے ساحرانہ نغمے ــــ یہ سب ایک طرف اور دوسری طرف لاکھوں
کروڑوں حشرات الارض ــــ سانپ، بچھو، شیر، ہاتھی، ریچھ،
دلدلیں، بیماریوں کے جراثیم، زہریلے کانٹے اور ہر وہ چیز جو
انسان کی جان کی دشمن ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے
اپنی قوتِ تخلیق کے سارے خزانے خوب ہی دل کھول کر ان جنگلوں
میں لٹائے ہیں۔ خوبی، کمال اور کثرت، تینوں چیزیں موجود ہیں!
ہر چیز میں نعمت ہو یا لعنت ــ کثرتِ مقدار و تعداد سب سے
نمایاں خصوصیت ہو۔ سبزہ اور قدرتی مناظر، دریا، جھیلیں، حسین
اور خوش گلو پرند ــــ اتنے ہیں کہ شمار سے باہر۔ اسی طرح
سانپ اور شیر اور خونخوار جانور ــــ اتنے ہیں کہ اُن کی تعداد
اندازے سے باہر ہے! الغرض لعنتوں اور نعمتوں کے اس ہجوم
میں جو انسان اپنی زندگی کے بارہ مہینے گذار دے اور پھر
وہ اس داستان کو بیان کرنے کے لئے زندہ بھی رہے وہ

انسان یقیناً آپ کے کلب کا ممبر بنائے جانے کا استحقاق رکھتا ہے!
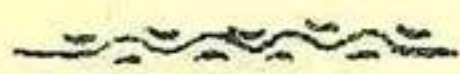
سرکاری پروانہ آیا تو ـــ مجھے یاد ہے ـــ ابا جان
بہت ہی خوش ہوئے لیکن ہمارا یہ حال تھا کہ اپنی قسمت
پر لعنت بھیجے گھر سے نکلے! کام ہمارا یہ تھا کہ ہم ان جنگلوں میں
بارہ مہینے دورہ کرتے رہیں اور دورے کا حال یہ تھا کہ دو
چار ملازم اور ماتحت ہمارے ساتھ اور ہم ـــ ایک خیمہ
دو گھوڑے ـ جن میں سے ایک کو ایک دفعہ شیر کھا گیا!) ایک
رائفل، ایک معمولی بندوق! ـــ جنگل میں جہاں دس پانچ گز زمین
کھلی ہوئی پائی ڈیرہ لگا دیا ـــ خیمے کے چاروں طرف خندق،
خندق میں رات بھر آگ روشن تاکہ خونخوار درندے خیمہ پر حملہ نہ
کر سکیں خیمے کے اندر ہم ایک پلنگ پر جس کے چاروں پائے پانی
سے بھری ہوئی ناندوں میں رکھے ہوتے تھے تاکہ زہریلے
جانور بستر پر نہ آ سکیں!! غروب آفتاب کے بعد سے طلوع آفتاب
تک یہ حال ہوتا تھا کہ ہم پلنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں فرش پر قدم رکھ
نہیں سکتے، ایک بندوق ہماری گود میں رکھی ہے، باہر خیمے کے
گرد، شیر دھاڑ رہے ہیں، سو سو دو دو سو ہاتھیوں کا گلہ چکر لگا
رہا ہے، دو چار ریچھ گھوم رہے ہیں ـــ یہ تو باہر کا حال
ہے ـــ اور اندر؟ ـــ خیمے کے اندر فرش پر سانپ

دوڑ رہے ہیں ۔۔۔ دو، چار، چھ، دس، ۔۔۔ ناچ رہے ہیں!

۔۔۔ ہماری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، جسم پر ٹھنڈا پسینہ ہے، ہاتھ قابو میں نہیں، پانی کی صراحی پاس رکھی ہے۔ ہر پانچ منٹ میں حلق کو تر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے! ۔۔۔ مغرب کے بعد سے طلوع آفتاب تک یہ حال رہتا تھا! آفتاب کی پہلی شعاع جنگل کی الجھی ہوئی شاخوں میں داخل ہوئی اور رات کا یہ تماشہ ختم ہوا۔ جنگل کے تمام خوفناک ایکٹر اسٹیج سے رخصت ہو کر اپنے اپنے ٹھکانے لگے اور صبح صادق کی روح پرور فضا میں خوش گلو پرندوں نے اپنے گیت شروع کر دیئے!! ۔۔۔ بارہ مہینے اللہ کی زمین پر، راقم الحروف کی زندگی اس طرح گزری ۔۔۔ غور کیجئے!!

قصہ مختصر، یہ جگہ تھی، یہ سماں تھا، یہ ماحول تھا، جہاں ایک عجیب و غریب واقعہ مجھ پر گزرا۔

جنگل کی سرحد پر، پیلی بھیت کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کا نام کھٹیما تھا۔ جنگل کے مصائب سے گھبرا کر کبھی کبھی میں اس آبادی کے پاس نکل آتا تھا اور کسی نہ کسی بہانہ سے دو چار دن یہاں گزار کر اپنے فرسودہ اعصاب کو آرام دیتا تھا۔ اس طرف آکر ٹھہرتے اور دم لینے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ کچھ کھانے

کو مل جاتا تھا۔ انسانوں کی کچھ غذا میسر آجاتی تھی، ورنہ اُن جنگلوں میں تو سوائے سوکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں اور آلوؤں کے کوئی چیز کسی بھاؤ نصیب نہ ہو سکتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ دودھ کا ایک قطرہ میسر نہ آسکتا تھا۔ حالانکہ اُن جنگلوں کا ہر کاشتکار دو دو سو گائے بھینسیں پالتا تھا اور اُس کے یہ گلے جنگلوں میں پھرتے رہتے تھے لیکن خدا کی اس انسان صورت جنگلی مخلوق کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ دودھ بھی کوئی پینے کی چیز ہے!! کھیٹما میں قریب کے اضلاع سے دودھ آتا رہتا تھا اور جب میں وہاں مقیم ہوتا تھا تو خدا کی یہ نعمت مجھے بھی نصیب ہو جاتی تھی! اپنی شیر خواری کے زمانہ میں دودھ کی طرف جو رغبت ہوگی وہی اب جوانی میں مجھے کھیٹما آنے کے لئے بیتاب کیا کرتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا جنت کی کسی نہر کا بہاؤ آسمان سے زمین کی طرف ہو گیا ہے۔ اور گویا اُس نہر کا خالص دودھ "کھیٹما" میں اللہ اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے!

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جب میرا کیمپ "کھیٹما" کی طرف آیا تو معلوم ہوا کہ بستی کے اندر سخت طاعون پھیلا ہوا ہے چنانچہ میرا خیمہ بستی سے کچھ فاصلہ پہ باہر لگایا گیا۔ اس موقع کا صحیح اندازہ اس نقشے سے کر لیجئے۔
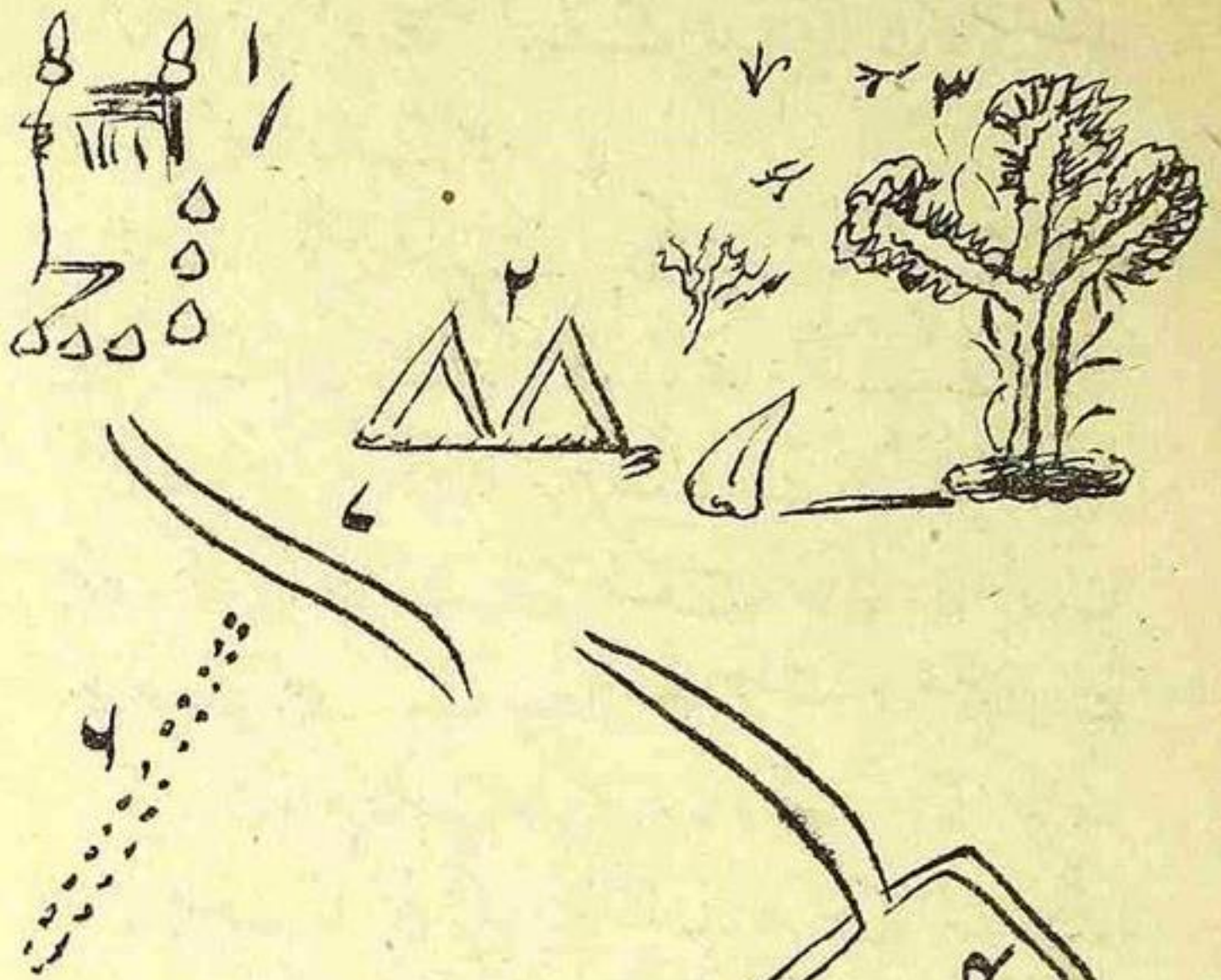
۱- کھٹما کی آبادی۔
۲- میرا کیمپ
۳- جنگل
۴- ایک خشک تالاب
۵- ایک گاؤں
۶- ریلوے لائن
۷- کچی سڑک

اس جغرافیہ پر عبور حاصل کرنے کے بعد واقعات کا سلسلہ بآسانی سمجھ میں آجائے گا۔

عموماً شام کو قبل مغرب میں اپنے کیمپ میں خیمے کے سامنے کچی سڑک کے پاس کرسی بچھا کر بیٹھا کرتا تھا۔ انسان کے ہم صورت جنگل کے جانور، جو اکا دکا اس طرف گزرتے تھے اُنکی صورتیں بیٹھا دیکھا کرتا تھا ۔۔۔ اس شغل میں تنہائی کے اوقات کٹ جاتے تھے ۔۔۔ اب داستان شروع ہوتی ہے

ایک دن شام کو حسب معمول میں سر راہ بیٹھا ہوا تھا۔ میرا منہ گاؤں کی طرف تھا۔ کچی سڑک پر جو خشک نالاب کے اندر سے گزر کر گاؤں کی طرف جاتی تھی میں نے ایک شخص کو آتے دیکھا۔ آٹھ مہینے مجھے اس جنگل میں گزر چکے تھے، اس سے پہلے اس وضع اور صورت کا انسان میں نے یہاں نہ دیکھا تھا اس لئے قدرتاً کرید پیدا ہوئی۔ جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگے تو بے اختیار میں نے اُن کو مخاطب کر کے کہا: "السّلام علیکم" وہ میری آواز سن کر رک گئے نہایت شائستہ اور شیریں آواز میں اُنھوں نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے کہا "تشریف لائیے" اور وہ بے تکلف خالی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

پہلے اس سے کہ داستان کا سلسلہ بڑھاؤں، ذرا اُنکا حلیہ بھی سن لیجئے:-

حلیہ کے متعلق کیا اس قدر کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ یہ صاحب اتنے حسین اور خوشرو تھے کہ میں نے اپنی عمر میں اُن سے زیادہ حسین آدمی نہیں دیکھا۔ مردانہ حُسن کا ایک عجیب و غریب نمونہ تھا جو میں نے نہایت میلے اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں دیکھا۔ آج تک وہ تصویر میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے! وضع قطع بھی دیکھ لیجئے: پاؤں میں زرد مخمل کی پھٹی ہوئی سلیم شاہی، چوڑی دار پاجامہ ــــ میلا اور پھٹا ہوا ــــ باریک ململ کا کرتہ جس پر لکھنوی چکن بنی ہوئی ــــ مگر نہایت میلا اور بوسیدہ۔ سر پر دو پلی ٹوپی ــــ وہ بھی میلی!! سر پر چھوٹے چھوٹے پٹے، بالوں میں تیل اور مانگ نکلی ہوئی، چہرہ پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں لیکن داڑھی ندارد منھ میں پان، آنکھوں میں سُرمہ ہلکا سا خط! ــــ یہ اُن کی تصویر ہے، میں نقاش یا مصور ہوتا تو رنگ اور موقلم سے کاغذ پر کھینچ دیتا ــــ ان کا بال بال میری نظر میں محفوظ ہے۔

میں نے کہا حضرت! آپ جیسا آدمی یہاں کہاں؟ کہنے لگے، کیوں؟ مجھ میں آپ نے کیا خاص بات پائی؟ میں نے کہا حُسن اور شائستگی جو اس ویرانہ میں عنقا ہے! مُسکرائے! کہنے لگے کیسی غلط بات آپ فرما رہے ہیں، حسن کی موجودگی سے کوئی جگہ خالی نہیں۔ اسی طرح جس طرح خدا ہر جگہ موجود ہے؟ آپنے نرالی

کے کھنبیوں، بچھوؤں، ناگنوں اور سانپوں میں حسن کو نہیں دیکھا؟" میں نے کہا "یہ سب صحیح، مگر اس اجاڑ میں آج پہلی ہی دفعہ تصوف کے یہ موتی بکھرتے ہوئے دیکھے ہیں۔" مسکرا کر کہنے لگے "اگر کان نہ سنیں اور آنکھیں نہ دیکھیں تو کیا اس دلیل پر ہم موتی کے وجود سے انکار کر سکیں گے؟ ــــ بھائی صاحب! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے ــــ بدصورت سے بدصورت مرد اور بدصورت سے بدصورت عورت میں حسن ازل موجود ہے ــــ ہم آپ دیکھتے نہیں!" ــــ

غرض کہ اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ یہ حضرت کوئی غیر معمولی انسان ہیں ــــ یہ وضع قطع اور حسن ازل پر گفتگو بہت سی معمولی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر وقت کم تھا ــــ انھوں نے کہا کہ مغرب سے پہلے اُن کی واپسی ضروری ہے اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

دوسرے دن وہ کوئی ۲ بجے آ گئے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ وطن اور مکان کہاں ہے۔ کہنے لگے "سامنے گاؤں میں رہتا ہوں ــــ کئی سال ہو گئے ــــ زراعت سے معاش پیدا کرتا ہوں ــــ فرصت کے اوقات میں جنگل کی سیر کرتا پھرتا ہوں ــــ" چاہتا تھا کہ پوچھوں

کہ آخر اس ویرانہ میں وطن کیوں بنایا ــــــ مگر ابتدائی
ملاقات میں کچھ ہمت نہ ہوئی ــــــ وہ ہر روز
آنے لگے اور ہر روز اُن کے نئے نئے کمالات اور
جوہر بھی آشکار ہونے لگے۔ شاعر تھے اور پھر سخن
فہم،، ہزارہا شعر، اُردو، فارسی کے
ان کو یاد تھے، ــــــ

کھانا نہایت نفیس پکاتے تھے۔ جیسا اُنھوں نے پکا
پکا کر کھلایا آج تک کبھی نصیب نہ ہوا۔ یا تو یہ حال تھا کہ
سوکھے آلو اور سوکھی مچھلی پر جسم و جان کے تعلق کا انحصار تھا۔
یا یہ "عیاشیاں" شروع ہوئیں کہ وہ روز کھانے پکانے کا کچھ
نہ کچھ سامان رومال میں باندھ کر لاتے اور بریانی اور کباب اور
مرغ اور قسم قسم کے میٹھے کھانے، بیٹھ کر پکاتے، خود بھی مزے لیکر
کھاتے اور مجھے بھی اتنا کھلاتے کہ کھاتے کھاتے لیٹ جاتا! ــــــ
شطرنج خوب ــــــ خوب نہیں بلکہ اُستادانہ ــــــ
کھیلتے تھے!

علمی حالت بہت بلند تھی جس مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے،
کم از کم مجھے تو زبان کھولنے کا موقع ملتا نہ تھا ــــــ

تین چار ہی دن میں کچھ ایسے بے تکلف ہو گئے کہ "تم" اور
"تو" تک نوبت آگئی۔ اور ذرا بے تکلفی بڑھی تو ٹپنے والی تم ہرہ

اور الٰہ آباد کی حسین چھپری اور کلکتہ کی گوہر کے تذکرے ہونے لگے ـــــ اس سلسلہ میں پتہ چلا کہ موسیقی سے صرف واقف ہی نہیں۔ بلکہ گاتے بھی خوب ہیں ـــــ

میں سوچتا تھا کہ خدا کی شان دیکھو، اس ویرانہ میں جہاں انسان کی صورت دیکھنے کو ترس گئے۔ یہ مافوق الانسان نظر آیا !! ـــــ

ـــــــــ

ایک دن کہنے لگے: "میاں! جانتے ہو دُنیا میں خدا کی دو بہترین نعمتیں کیا ہیں۔؟"

میں نے کہا: "کیا؟" کہنے لگے "ایک نعمت حسین عورت اور ایک نعمت اچھی غذا!"

"مگر" ـــــ کہنے لگے ـــــ "اس اُلّو کے پٹھے نے ـــــ جس کا نام انسان ہے، کبھی نہ جانا کہ ان دو نعمتوں سے مستفیض کیونکر ہونا چاہیئے! ـــــ عورت کو بچہ پیدا کرنے کی مشین یا اپنی نفس پرستی کا آلہ بنا لیا اور اچھی غذاؤں کو اس گنوار پن کے ساتھ کھانا شروع کیا کہ بدہضمی ہونے لگی! ـــــ اب ضعف باہ اور ضعف معدہ کے لئے نسخے تلاش کرتا پھرتا ہے!" میں نے کہا:۔ "شاید مرد کی فطرت ہی یہ ہے؟" کہنے لگے "کیا بکواس کرتے ہو۔ فطرت بھی کبھی غلط ہو سکتی

ہے ــــــ فطرت کا نام کیوں لیتے ہو ــــــ جس کو تم جیسے گدھے فطرت کہتے ہیں وہ در حقیقت تمہارا آوارہ اور بے کار نفس ہے ــــ" پھر کچھ سوچ کر بولے "نہیں معلوم ہے عورت عنقریب اپنا بدلہ تم سب سے لینے والی ہے۔ ایک لطیفہ سناؤں ــــــ ان جنگلوں میں ایک وحشی قوم آباد ہے ــــ تعداد تو زیادہ نہیں، یہی کوئی دس بارہ ہزار نفوس ہیں مگر ان کے تمدن میں مرد اور عورت کی حیثیت بالکل منقلب ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کی قوم میں ہر عورت برہمن ہے اور ہر مرد چمار! یعنی میاں بیوی اور باپ بیٹی ایک دوسرے کے قریب نہیں آسکتے، ایک دوسرے کے ساتھ کھا نہیں سکتے، ایک دوسرے کا برتن استعمال نہیں کر سکتے! عورت کی نظر میں مرد نجس العین ہے! ــــــ یہ اس بغاوت کی بدترین صورت پیدا ہوگی ــــــ"

اُن کی گفتگو کا یہ ایک نمونہ میں نے پیش کیا۔ اُن کی وجہ سے کئی ہفتے میں "کھٹیما" میں ٹھہرا رہا۔ بہت چاہا کہ وہ دورہ میں میرے ساتھ چلیں یا کسی رات کو میرے خیمہ میں قیام کریں لیکن اس پر وہ کبھی آمادہ نہ ہوئے ــــ

چند روز کے لئے میں جنگلوں میں چلا گیا۔ پھر ان کی یاد کا ستایا ہوا "کھٹیما" آیا۔ جس دن میں آیا اس کے دوسرے دن صبح کو وہ آئے

کوئی ۱۱ بجے کا وقت تھا میں خلافِ معمول خیمہ کے فرش پر بیٹھا ہوا کچھ دفتر کے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ میرا پیشکار سامنے بیٹھا تھا میں عموماً سانپوں کے ڈر سے بہت کم فرش کی نشست پسند کرتا تھا لیکن اس دن حساب کتاب کے بہت بڑے بڑے رجسٹر دیکھنے تھے اس لیئے ان کو پھیلا کر سامنے رکھنے کے لیئے فرش پر بیٹھنا پڑا تھا۔ وہ آئے اور وہیں فرش پر میرے پاس بیٹھ گئے۔

یکایک میرا پیشکار اٹھ کر بھاگا۔ "سرکار سانپ ـــ!"

"ارے کہاں، کدھر؟" میں نے کہا۔

"کتاب کے نیچے کتاب کے نیچے اس کو نہ چھیڑیئے۔" پیشکار بالکل بدحواس ہو رہا تھا۔ میں بھی اٹھ کر بھاگا۔ اور بھاگ کر خیمہ کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

یہ حضرت اس تمام شور و شر میں بدستور بیٹھے رہے۔ چہرہ پر وہی مسکراہٹ قائم تھی جو ہمیشہ اُن کے چہرے پر کھیلتی رہا کرتی تھی۔ میں نے کہا "خدا کے لئے بھاگو، بیٹھے کیا دیکھ رہے ہو؟" مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑی کتاب کو اٹھایا ـــ بھورے رنگ کا ایک پتلا، ڈیڑھ ہاتھ لمبا سانپ پھنکار مار کر اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں مبہوت اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بے تکلف ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ سانپ نے پلٹ کر اُن کے ہاتھ کی پشت پر پے در پے تین جگہ کاٹا ـــ تینوں جگہ خون نکلنے

لگا ـــــ دوسرے ہاتھ سے انہوں نے اس کا سر توڑ کر جسم سے علٰحدہ کر لیا، اور اس کو خیمہ کے باہر پھینک کر اپنے کرتے کے دامن سے اپنے ہاتھ کا خون صاف کرنے لگے۔

"بہت زہریلی قسم کا تھا یہ سانپ، ہم لوگ اس کو سینگ کہتے ہیں ـــــ دیکھنا ذرا کسی ملازم سے کہو کہ اس کے سر کو کچل کر کہیں دور پھینکوا دے۔"

وہ اپنی جگہ پر بیٹھے یہ ہدایات جاری فرما رہے تھے اور میں ان کی صورت دیکھ رہا۔"

جاؤ جاؤ، بہت جلدی ڈاکٹر کو لاؤ" میں نے پیش کار سے کہا "جی نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ گھبراؤ نہیں خون نکل گیا زہر بھی نکل گیا۔ انہوں نے اس قدر اطمینان کیساتھ فرمایا کہ مجھے غصہ آگیا۔

"عجب الو ہو تم! سانپ کا زہر بھی ایسی چیز ہے جسے تم ہضم کر جاؤ، انسان ہو یا کوئی دیو یا بھوت" میں نے جل کر کہا۔

"خیر جانے دو، ہوش میں آؤ، یہاں آکر بیٹھو، آؤ! پسینہ پونچھو! انسان بنو! کہہ تو دیا تم سے کہ مجھ پر سانپ کے زہر کا اثر ہی نہیں ہوا کرتا۔"

"دس منٹ میں تم لمبے لمبے لیٹ جاؤ گے ـــــ شاید اپنی جوانی پر اکڑ رہے ہو۔"

وہ مسکرا رہے تھے!!

"بات اصل یہ ہے کہ میں عادی ہو گیا ہوں، ہزاروں دفعہ سانپوں نے کاٹا ہے، اب کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔"

"سانپ کاٹے اور اثر نہ ہو! یا تم باؤلے ہو یا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"پاگل نہ تم ہو نہ میں ہوں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ دیکھو، خود تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مجھ پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ اچھا اب ذرا باورچی کو بلاؤ تو میں پر پانی پکانے کا انتظام کروں۔"

آج تک میں حیران ہوں کہ وہ قصہ کیا تھا۔ ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے اُن کو کوئی دوا ایسی معلوم ہو یا کوئی عمل یا تعویذ ایسا ہو جو اُن کو سانپ کے زہر سے محفوظ رکھتا ہو، بہت پوچھا بہت اصرار کیا، لڑا جھگڑا، خوشامد کی، مگر اس اللہ کے بندے نے کچھ بھی نہ بتایا کہ یہ بھید کیا ہے۔

ایک دن میں اور وہ بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے، باتوں باتوں میں ان جنگلوں کے زہریلے جانوروں کا ذکر آ گیا، کہنے لگے "تم نے کبھی یہاں کے کنکھجورے دیکھے ہیں؟"

میں نے کہا دیکھے تو نہیں مگر سنا ہے کہ بالشت بالشت بھر لمبے ہوتے ہیں اور بے حد زہریلے!" کہنے لگے "میں

تمہیں دکھاتا ہوں۔"

یہ کہکر انہوں نے سر سے ٹوپی اتاری اور اس کو سامنے فرش پر لوٹ دیا۔ میں کیا بتاؤں میرا کیا حال ہوا۔ میں سانپ سے زیادہ بچھو سے ڈرتا ہوں اور وہ بچھو جو ان کی ٹوپی میں سے نکلا ——— اللہ محفوظ رکھے ——— دس انچ سے تو کم نہ ہو گا! میں اٹھ کر بھاگا۔ میں نے کہا "خدا کے لیئے اٹھاؤ اس کو، میرا تو دم فنا ہو رہا ہے! مسکراتے ہوئے انہوں نے اس کا ڈنک پکڑ کر اٹھا لیا اور پھر اپنی ٹوپی میں رکھ کر ٹوپی سر پر رکھ لی۔

ہو نہ ہو کوئی عمل یا تعویذ ہے۔" میں نے کہا "کچھ بھی ہو — تمہیں بتانا ہو گا ——— اپنی تمہاری جان ایک کر دوں گا ——— آج تم نہیں یا میں نہیں ——— بتاؤ۔"

میں اُن کے سر ہو گیا۔ کہنے لگے "بیٹھو، ذرا دم لو، بات سنو، اس کو ——— میرے سر ہونے سے کیا فائدہ۔ کچھ ہو تو بتاؤں، کیسا عمل اور کیسا تعویذ، میں نماز تک تو پڑھتا نہیں ——— اللہ کا نام لینا ہی دشوار ہے، بھلا عمل اور تعویذ کا کیا ذکر ہے، میں بے چارہ ساری عمر کا رند اور خرابانی میں کیا جانوں پیروں کی کرامات"

میں نے کہا "میں تو نہ مانوں گا کچھ تو ضرور ہے! سانپ کا زہر تم پر اثر نہیں کرتا، ایسے خوفناک بچھو کو تم سر پر رکھے

پھرتے ہو ــــــ"

قطع کلام کر کے کہنے لگے۔" سنو، سنو، تم نے کبھی خوف کے فلسفہ پر غور نہیں کیا، انسان کے تمام محسوسات میں خوف سب سے قوی ہے۔ مذہب والوں نے بھی اُس کی قوت سے بہت کام لیا ہے، پیر، فقیر اور حاکم سب اسی سے کام لیتے ہیں۔ خوف نہ ہو تو دنیا میں کوئی کسی کا محکوم نہ رہے ـــــــ یہ جو سب لمبی لمبی داڑھیوں والے اپنے ہاتھوں پر بیعت کراتے ہیں، لوگوں سے چھوا تے ہیں، گلے میں ہار ڈلواتے ہیں۔ یہ سب اسی جنس کے سوداگر ہیں دلوں میں خوف پیدا کر کے کاروبار چلاتے ہیں۔ اپنی زندگی کی ترکیب سے خوف کے عنصر کو نکال دو۔ پھر دیکھو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مرعوب نہیں کر سکے گی۔ سانپ کے زہر میں ہلاکت کے جن اجزأ کو شامل سمجھتے ہیں وہ درحقیقت زہر کے اندر موجود ہی نہیں، وہ خود تمہارے اندر ہیں۔ اپنے اندرون کو اُن اجزاء سے پاک کر لو، پھر سانپ کے منہ میں انگلی ڈال دو۔ ویسے ہی محفوظ رہو گے جیسا میں ہوں! سمجھے ؟"

" خاک بھی نہ سمجھا!" میں نے کہا " سمجھوں تو جب جب تم سمجھنے کی کوئی بات کہو ــــــ خوف کا ایک عجیب فلسفہ نکال کر لائے ہو، خوف تو فطرت انسانی کا ایک جزو ہے۔"

"نہیں، غلط! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ خوف فطرتِ انسانی کا ایک جزو ہے۔ شیر خوار بچّہ بالکل بے خوف ہوتا ہے سانپ کا منہ اُس کے منہ پر رکھ دو، آگ کی طرف اُس کا ہاتھ لے جاؤ، کبھی خوف زدہ نہ ہوگا۔ مگر جب شعور آئے گا تو وہ دیکھے گا کہ آگ سے سب ڈرتے ہیں، سانپ سے سب خوف زدہ ہیں، خوف کے جراثیم اُس کے دماغ میں جگہ پائیں گے اور اُس کی فطرت مسخ ہو کر رہ جائے گی۔"

"عجیب مسخرے ہو۔" میں نے کہا "ساری دنیا کے علوم سے اور انسان کی صدیوں کی تحقیقات سے انکار کر کے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو — میں اصل حقیقت معلوم کر کے رہوں گا، آج نہ سہی کل سہی۔"

غرض کہ ہر روز ان سے اسی طرح تُو تُو میں میں ہوتی تھی۔ مگر اللہ کا بندہ کبھی نہ کھلا۔ اُس نے کبھی ایک حرف ایسا نہ کہا جس سے پتہ چلتا کہ یہ راز کیا ہے۔ وہ جس قدر ٹالتا میری کرید بڑھتی۔ آخر ایک دن میں نے جھلا کر کہا۔

"آج کے دن سے تم میرے قیدی ہو، اب تم کو میرے ہی پاس رہنا ہے، لعنت بھیجو کھیتی اور کاشتکاری پر، میں جہاں جاؤں میرے ساتھ رہو، ابھی دو چپراسی بھیج کر تمہارا سامان منگوائے لیتا ہوں۔" ——— یکایک اس

کا مسکراتا ہوا چہرہ نہایت سنجیدہ ہو گیا۔ پیشانی پر شکن، آنکھوں میں ایک سا قسم کی چمک، آواز میں لچک کی بجائے کرختگی ——
یہ رنگ میں نے آج تک دیکھا ہی نہیں تھا۔ کہنے لگے۔
" مذاق اور دل لگی سے قطع نظر ایک بات میری سن رکھو، وہ یہ ہے کہ میری تمہاری دوستی کی پہلی اور محکم شرط یہ ہے کہ مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں تمہارے پاس رہوں گا۔ یا کبھی ایک شب بھی تمہارے پاس گزاروں گا —— میری تمہاری دوستی دن بھر کی ہے، وہ بھی جب تم کھٹیا آؤ۔ میں کون ہوں میں کہاں رہتا ہوں، میں کیا کرتا ہوں — اس سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں۔ جس دن تم نے ان باتوں کی تلاش شروع کی ہمارا تمہارا یارانہ ختم! اسی دن ہم تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت! یہ خوب سمجھ لو — اب چھوڑو ان فضول باتوں کو کچھ اور مزے مزے کی باتیں کرو — آؤ شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔"
میں نے کبھی پہلے ان کی یہ حالت نہ دیکھی تھی کچھ مرعوب سا ہو کر حیران رہ گیا۔

ایک دن کہنے لگے "تمہیں مچھلی کے شکار کا بھی کچھ شوق ہے؟" میں نے کہا "شوق تو ہے مگر میرے پاس سامان نہیں۔" کہنے لگے "سامان سب میں لے آؤں گا۔ یہاں

ایک پہاڑی چشمہ میں آج کل مچھلیاں بہت ہیں کل تمہیں فرصت ہو تو چلیں ۔۔۔"

چنانچہ دوسرے دن وہ آئے ۔ مچھلی پکڑنے کی ڈنگنیں اور کلنٹے اور چارہ سب لیکر آئے ۔ میرے کیمپ سے دو میل کے فاصلہ پر جنگل کے اندر وہ ندی تھی ۔ ہم دونوں کنارے پر جا بیٹھے کانٹے پانی میں ڈال دیئے ۔ مچھلیاں تو بہت تھیں مگر کانٹے کو نہ لگتی تھیں گھنٹہ دو گھنٹہ انتظار کر کے میں اکتا گیا ۔

کہنے لگے "کبھی تم نے ہاتھ سے بھی مچھلیاں پکڑی ہیں ۔ "آؤ میرے ساتھ ۔" یہ کہکر وہ کمر کمر پانی میں گھس گئے ۔ میں کیا بتاؤں میں نے کیا دیکھا ۔ ایک لمحہ کے اندر سینکڑوں مچھلیاں بڑی اور چھوٹی ۔۔۔ اُن کے چاروں طرف کو دنے لگیں اور وہ اُن کو ہاتھ سے پکڑ پکڑ کر کنارے پر پھینکنے لگے ۔۔۔ مچھلیاں اس طرح اُن کی طرف آتی تھیں جس طرح مقناطیس لوہے کے ٹکڑے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور میں حیران و ششدر یہ تماشہ دیکھ رہا تھا ۔

آخر وہ دریا سے باہر آئے ! میں نے کہا "قسم ہے تمہیں اپنے خالق کی ۔ یہ کیا جادو کیا تم نے ؟ اصل حال مجھے بتاؤ" ہنسنے لگے چھوٹی چھوٹی خفیف باتیں بھی جن کو انسان نہ سمجھے کسقدر بڑی اور اہم بن جاتی ہیں ۔۔۔ تم جب اس فن سے واقف ہی نہیں تو سمجھو کیا خاک ۔۔۔"

میں نے کہا "مردِ خدا پانی کو بچا کر مچھلیاں پکڑتے میں نے لوگوں کو دیکھا ہے اور بھی بہت سی ترکیبیں معلوم ہیں مگر اس طرح مچھلیوں کو آدمی کے جسم سے چپٹتے ہوئے تو میں نے نہ سُنا نہ دیکھا" کہنے لگے "ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے اور سُنا ہی کیا ہے — بچہ ہو — لو چلو اب مچھلیوں کو چل کر پکائیں۔"

ایک دفعہ شیروں اور اسی قسم کے خونخوار جانوروں کا کا ذکر ہو رہا تھا کہنے لگے کہ "اگر تم شیر سے خوف نہ کرو تو وہ تم سے خوفزدہ ہو سکتا ہے۔ خوف کے فلسفہ کو سمجھ لو پھر تم میری حرکتوں پر ذرا بھی متعجب نہ ہو گے۔ تم نے سُنا ہوگا لوگ شیر کی گردن پر سوار ہو جاتے ہیں اور ایسی تصویریں تو بہت دیکھی ہوں گی۔ پھر کیا یہ لوگ جو ایسا کر سکتے ہیں جادوگر ہوتے ہیں؟ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شیر کے دل میں خوف پیدا کر دیتے ہیں اور اپنے دل سے نکال دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "خدا کے لئے کیوں مجھ سے مذاق کرتے ہو کل کو کہنے لگو گے کہ میں خود شیر بن سکتا ہوں، ہاتھی کی صورت اختیار کر سکتا ہوں — یہ طلسم ہوشربا کی داستانیں! جو کچھ نہیں آتا ہے وہی مجھے بتا دو —"

ایک دن وہ میرے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے، میرا پیشکار روتا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ اس کی اکلوتی لڑکی کو طاعون ہو گیا اور وہ بستی میں پڑی ہے۔ شطرنج چھوڑ کر یہ حضرت اٹھ کھڑے ہوئے چلو میں دیکھوں، مجھ سے کہا تم بھی چلو۔ میں نے عذر کیا۔ ہنسنے لگے، "پھر وہی خوف! جب تک خوف تمہارے دل میں جگہ نہ پائیگا، طاعون کبھی غالب نہیں آسکتا! لوگ طاعون میں مبتلا ہو کر صرف اس لئے مرتے ہیں کہ طاعون سے ڈرتے ہیں۔ خوف اُن کی جان لیتا ہے نہ کہ طاعون!" میں اُن کا منہ دیکھتا رہ گیا وہ یہ کہکر بستی کی طرف چل دیئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے۔ میں نے کہا کیا کیا تم نے؟ کیا حال ہے مریضہ کا۔" کہنے لگے "برا حال ہے، میں کر تا ہی کیا، نہ طبیب نہ ڈاکٹر ———— خدا کرے بے چاری تندرست ہو جائے اکلوتی اولاد ہے۔

دوسرے دن صبح کو میں نے اپنے پیشکار سے پوچھا تو اس نے کہا کہ رات بھر میں لڑکی کا بخار بھی اتر گیا اور گلٹیاں بھی غائب ہو گئیں۔ میں نے دریافت کیا کہ دوا بھی کچھ دی تھی یا نہیں تو وہ کہنے لگا کہ دوا تو کچھ بھی نہیں دی۔ البتہ تھوڑا سا گڑ پانی میں گھول کر پلایا تھا اور یہ حکم دے آئے تھے کہ تھوڑا تھوڑا گڑ کھاتی رہے

تھوڑی دیر بعد یہ حضرت جو آئے تو میں نے کہا "کیوں جی! یہ کیا شعبدہ دکھایا تم نے، گڑ کھلا کے طاعون کا علاج!

کہنے لگے "یوں بھی ہوتا ہے علاج! ——— آج میں شطرنج کا ایک نیا نقشہ سوچ کر آیا ہوں، لاؤ تو ذرا بساط۔"

اس شخص نے میرے دماغ میں اتنے الجھیڑے ڈال دیئے تھے کہ میری عقل اُن الجھنوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھی، حیران بھی ہوتا تھا، چڑیا تا تھا، غصّہ بھی آتا تھا۔ مگر کرتا کیا؟ بحث کروں تو وہ الٹا مجھ ہی کو بے وقوف بنا دیتے تھے ——— میں روحانیات "کرامات" اور "معجزوں" کا قائل نہیں، مادیت اور دہریت کی طرف جھکا ہوا ہوں۔ والد کبھی کبھی میری موجودگی میں اپنے ہم عمر دوستوں کو اس قسم کے قصے سنایا کرتے تھے تو میں بیٹھا بیٹھا اُن کی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ہنسا کرتا تھا۔ شعبدہ بازوں کے شعبدے بہت سے دیکھے تھے۔ ہر ایسی "کرامات" کو اُن شعبدوں میں شامل کر کے سمجھ لیا کرتا تھا کہ پیر جی یا شاہ صاحب نے ابا جان کو خوب احمق بنایا ——— مگر اس شعبدہ باز نے تو میرے چھکے چھڑا دیئے۔ یہ تو آج تک مجھے یقین نہیں ہے کہ اس شخص کی غیر معمولی حرکتیں کوئی روحانی اہمیت رکھتی ہیں مگر کچھ ایسا پکڑا گیا ہوں کہ اس کو جھٹلا بھی نہیں سکتا۔

ایک دفعہ میں نے ارادہ کر لیا کہ اس شخص کی پوری تاریخ

معلوم کی جائے اور اُس کے ماضی و حال سے کچھ اسکی کیفیات کا اندازہ کیا جائے — ایک دن صبح کو وہ آئے۔ شام تک میرے پاس رہے، حسبِ معمول مغرب سے پہلے رخصت ہوکر اپنے گاؤں کی طرف چلے — میں نے دل میں کہا کہ آج تو ان کا پتہ نشان معلوم ہی کر لینا ہے۔ کہاں جاتے ہیں کہاں رہتے ہیں، کرتے کیا ہیں — وہ جب سو دو سو قدم آگے بڑھ گئے تو میں نے اپنے سائیس سے کہا کہ گھوڑا لیکر ان کے پیچھے پیچھے آئے اور خود ایک لکڑی ہاتھ میں لیکر ان کے پیچھے چل دیا۔ کھلے ہوئے میدان میں وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔ ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ کہیں لوٹ کر دیکھ نہ لیں۔ بہر حال وہ چلتے چلتے خشک تالاب کے پاس پہنچے اور چونکہ وہ کچی سڑک اُس خشک تالاب کے اندر ہوکر گذرتی تھی۔ وہ تالاب کے نشیب میں میری نظر سے اوجھل ہو گئے — لیکن جب میں تالاب کے کنارے پہنچا تو سڑک خالی تھی اور وہ غائب تھے، جنگل نہ تھا جس میں وہ اِدھر اُدھر نکل گئے ہوں، پہاڑیاں نہ تھیں، غار نہ تھے، کوئی آبادی نہ تھی جہاں وہ چھپ رہتے۔ کھلا ہوا میدان اور خشک تالاب — کھلی ہوئی کچی سڑک جو میرے خیمہ سے سیدھی گاؤں کی طرف جاتی تھی! پھر وہ کہاں گئے کیونکر چھپ گئے، کس طرح غائب ہو گئے۔ یہ سوالات ہیں جو آج تک تشنۂ جواب ہیں — ان کو تلاش کرنے کے لئے

کیا کچھ میں نے نہیں کیا، کہاں کہاں آدمی نہ دوڑائے! اس گاؤں کا ایک ایک گھر چھان مارا۔ کھٹیما کے ایک ایک آدمی سے دریافت کر لیا، جنگلوں میں ڈھونڈھ لیا۔ لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن، آخری دفعہ میں نے اس خشک تالاب کے کنارے اُن کو دیکھا اور پھر کبھی نہ دیکھا۔

یہ واردات میری زندگی کا ایک عجیب معمّہ ہے۔

ہرجائی

"اڈیٹر صاحب" نے یہ تحریر بطور فیس داخلہ
پیش کی ہے۔ اراکین انجمن کی رائے میں قصہ
کافی دلچسپ اور عجیب ہے۔ اس لئے
"اڈیٹر صاحب کو انجمن کا رکن قرار دیا جاتا ہے۔

مشرب رندانہ، مزاج مجذوب، طبیعت آزاد، عقائد لامذہبی کی طرف مائل اور پیشہ اخبار نویسی۔ جنگ یورپ شروع ہو چکی تھی۔ میرا اخبار بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اور اُس زمانہ میں بہت مقبول تھا۔ حکومت کی ٹیڑھی نظریں مجھ پر پڑ رہی تھیں میں بھی چھیڑ سے باز نہ آتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو میدان جنگ کی خبروں پر سرخیاں ایسی ہی لکھتا تھا جیسے سانپ بچھوؤں کے ڈنک۔ اتحادیوں کی فتح کو بھی شکست بنا دیتا تھا اور دشمن کی شکست بھی میرے اخبار کے کالموں میں "شاندار مدافعت" کے نام سے یاد کی جاتی تھی!

— پھر کیا تعجب ہے کہ حکومت مجھ سے حد درجہ ناخوش تھی —

غضب یہ ہوا کہ اُسی زمانہ میں افغانستان کی طرف سے خطرات پیدا ہونے لگے۔ افغانوں سے میرے تعلقات وسیع تھے لہٰذا اب تو خفیہ پولیس کی نگرانی مجھ پر اتنی سخت ہو گئی کہ اگر گھر میں بیٹھ کر روٹی بھی کھاتا تو نوالوں کی صحیح تعداد پولیس کے رجسٹر میں درج ہو جاتی تھی! — یہ اُس زمانہ کا واقعہ ہے۔

میرا معمول یہ تھا کہ ہر شنبہ کی شام کو چند دوستوں کیساتھ

شہر کے باہر ایک لکھ پتی دوست کے باغ کی "صحبت عیش" میں شریک ہوا کرتا تھا، یک شنبہ کا پورا یوم تعطیل وہیں گذرتا تھا، دوشنبہ کی صبح کو ہیں شہر واپس آتا تھا۔ یہ باغ ایک نوجوان بوہرے سوداگر کا تھا اور اُس صحبت احباب میں میرے ایک خاص ہم نفس کلکتہ کے ایک نوجوان بیرسٹر تھے جو اب ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ ہر ہفتہ کم از کم ۲۴ گھنٹے اس طرح بسر ہوتے، کہ کچھ موسیقی کا شغل ہے کچھ لطیف اغذیہ ہیں اگر چاندنی رات ہے تو باغ کے وسط میں مرمریں حوض کا کنارہ ہے، کبھی قوالی ہے، کبھی ناچ اور گانا ہے، ہُو حق ہے اور اس کے تمام یا اکثر ملحقات!!

اس طرح شنبہ کی شام کو ایک دفعہ ہم سب وہاں گئے۔ یکشنبہ کو دن بھر شطرنج اور تاش کا شغل ہوتا رہا، رات کو ایک مشہور مغنیہ نے اُس محفل کو اپنی موجودگی سے نوازا، دو بجے رات تک گانا ہوتا رہا جوانوں کی محفل میں، اگر شام سے صبح تک جلسہ نہ کھڑکے تو پھر وہ محفل ننگ جوانی ہے!! مگر "بی صاحبہ" تھکی ہوئی تھیں دو بجے گھر چلی گئیں۔ کچھ دیر تو ہم سب لب حوض پڑے ہوئے خود ہی گایا بجایا کئے اُس کے بعد جوانی پر نیند غالب آئی، صبح سب کو شہر واپس جانا تھا، اس لئے اپنے اپنے بستر پر جا پڑے ــــــ

ایک چھوٹا سا پہلو کا کمرہ تھا جس میں دو بستر لگے ہوئے تھے، ایک پر میں اور ایک پر میرے دوست بیرسٹر صاحب، موسم قدرے گرم تھا اس لئے کمرہ کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا۔ لیمپ کی بتی نیچی کر کے اُس کو فرش پر رکھ دیا، ہم دونوں سو گئے! ــــــ

صبح کو تین اور چار بجے کے درمیان میری آنکھ دفعتاً کھلی اور یہ محسوس ہوا کہ گویا کوئی تیسرا شخص کمرہ میں داخل ہوا ہے۔ صبح کاذب کی روشنی کمرے میں لیمپ کی دھیمی روشنی سے مل کر ایک عجب قسم کا غیر قدرتی نور پیدا کر رہی ہے، میں نے دیکھا کہ بالکل سفید ــــ از سر تا پا ــــ لباس پہنے ہوئے کوئی صاحب کمرہ کے اندر داخل ہو رہے ہیں، وہ آہستہ آہستہ میرے پلنگ کی طرف بڑھتے آتے تھے۔ اُن کا حلیہ اور اُن کی وضع قطع ذہن نشین کر لیجئے۔

لمبی اور گھنی سفید داڑھی ــــ سفید بُراق ــــ چہرہ نہایت نورانی ــــ سُرخ و سفید ــــ چہرہ کا انداز مغلئی ــــ سفید لانبا کُرتا، کمر سے ایک سفید ٹپکا بندھا ہوا ــــ سفید شلوار، پاؤں میں ــــ مجھے یاد نہیں کہ کس رنگ کا ــــ پنجابی جوتا ــــ قد میانہ بلکہ میانہ سے بھی کچھ کم ــــ اس وضع قطع کا انسان ــــ بالکل خواجہ خضر! ــــ اور پھر ہمارے گھر میں!! ہمارے تمام تخیلات سے کس قدر دُور اور بعید تھا! ــــ میں ذرا چونکا اور ایک لمحہ اُن کو اپنی بڑھتے دیکھا رہا، پھر ذرا گھبرایا اور گھبرا کر چلایا "کون ہے؟ کون ہے؟ اتنے زور سے میری آواز بلند ہوئی کہ کمرہ گونج گیا اور برابر پلنگ پر نوجوان بیرسٹر صاحب گھبرا کر اُٹھ بیٹھے "کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟" انھوں نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے مجھ سے سوال کیا ــــ اس سوال و جواب میں دو منٹ بھی بہ مشکل صرف ہوئے ہوں گے لیکن وہ سفید

پوش پیر مرد جہاں کھڑے تھے وہیں غائب ہو گئے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کب گئے، کدھر گئے، کیونکر گئے۔ بہرحال ایک عکس کی طرح وہ میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں نے جب یہ ماجرا نوجوان بیرسٹر صاحب سے کہا تو وہ جھنجلا گئے۔

"لاحول ولاقوۃ، نیند خراب کر ڈالی، جب ہی تو تم سے کہتا ہوں کہ ذرا کم کھایا کرو، اناڑی کی بندوق کی طرح پیٹ بھر لیتے ہو، بد خوابی ہوتی ہے تو دوسروں کو بھی بے آرام کرتے ہو!"

میں نے جب اصرار کیا کہ میری نظر نے دھوکہ نہیں کھایا تو وہ اور بگڑے:۔

"کہیں تمہارے دادا صاحب تو قبر سے اٹھ کر تشریف نہ لائے ہوں! پوتے کے دیدار کے لئے ترس رہے ہوں گے بچارے! خدا جانے کہاں کہاں ڈھونڈ کر یہاں تک پہنچے —— جاؤ دیکھو باہر باغ میں نہ رہے ہوں!!"

میں نے پھر کچھ کہنا چاہا تو انھوں نے زانو کا ایک تکیہ نکال کر میرے سر پر مارا۔ "اُلّو!!" اور یہ کہہ کر کروٹ لے لی۔

صبح کو ہم لوگ شہر آ گئے، میں دس بجے اپنے دفتر میں آیا۔ یہ وقت میری انتہائی مصروفیت کا وقت ہوتا تھا اس لئے کہ ۱۲ بجے اخبار کی آخری کاپی پریس کو جاتی تھی۔ لہذا دفتر کے اہلکاروں کو عام ہدایت تھی کہ کوئی بھی مجھ سے ملنے آئے، میرے کمرہ میں نہ بھیجا جائے ——
—— ۱۱ بج چکے تھے اور ابھی مجھے ایک ضروری نوٹ لکھنا باقی تھا کہ

چپراسی نے اندر آکر اطلاع دی کہ کوئی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے اسکو جھڑکا:۔

"نہیں معلوم نہیں کہ میں اس وقت کسی سے نہیں مل سکتا؟"۔

چپراسی نے عذر کیا کہ باوجود منع کرنے کے وہ صاحب ملاقات پر مصر ہیں۔ بہت ہی جھلاکر میں نے کہا اچھا بلاؤ۔ ـــــ دروازہ کا پردہ اٹھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہی رات والے "خواجہ خضر" مسکراتے ہوئے تشریف لارہے ہیں! ـــــ ایک لمحہ میں غرق حیرت ہوکر بدحواس ہوگیا، پھر گھبراکر کھڑا ہوگیا "آئیے، آئیے، تشریف لائیے" میں نے بہت ہی ذوق و شوق کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔

"معاف کیجئے میں اس وقت حرج کارکرنا نہیں چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں، صرف یہ بتا دیجئے کہ مکان پر آپ سے کب اور کس وقت ملاقات ہوسکے گی؟ تخلیہ میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں"، انھوں نے بہت آہستہ آہستہ اور نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ یہ الفاظ ادا کئے مگر میں تو اب ان سے باتیں کرنے کے لئے بے تاب تھا:۔

"نہیں صاحب! مجھے فرصت ہے، تشریف تو رکھئے"، میں نے کہا۔ انھوں نے فرمایا "جی نہیں، اس وقت تو میں نہ ٹھہروں گا صرف ملاقات کا وقت مقرر کرنے آیا تھا ـــــ"

غرض یہ کہ تقریبًا پانچ منٹ تک میری طرف سے اصرار اور اُن کی طرف سے انکار ہوتا رہا۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ وہ بعد مغرب

میرے مکان پر تشریف لائیں ــــــ

اُس دن بعد مغرب میری بے چینی اور بے تابی انتظار ناقابلِ بیان تھی۔ سات بجے، آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے، دروازے پر کھٹکا ہوتا تھا تو میں اوپر کی منزل سے سڑک تک دوڑتا ہوا آتا تھا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، شاید دس دفعہ اسی طرح اوپر کی منزل سے اُترا اور چڑھا!! کبھی اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگتا۔ کبھی کوئی کتاب اُٹھائی، کبھی کمرہ میں ٹہلنے لگتا۔ آنکھیں دریچہ کے باہر، کان آواز پر لگے ہوئے ــــــ رات کے ۱۲ بج گئے مگر وہ نہ آئے! مایوس ہو کر بستر پر لیٹ گیا، پھر بھی نوکروں سے کہہ دیا کہ دروازہ کا خیال رکھیں کوئی آواز دے تو فوراً کھول دیں! ــــــ

ساری رات گزر گئی، وہ نہ آئے، صبح کو میں دفتر میں گیا۔ یہ اُمید تھی کہ شاید دفتر میں پھر تشریف لائیں۔ دن بھر انتظار کے پیچ و تاب میں دل لگا کر کام بھی نہ کر سکا ــــــ لیکن وہ نہ آئے! پھر شام کو گھر پر انتظار رہا، ایک دوست کے یہاں جا کر کھانا کھانے کا وعدہ کر چکا تھا، مگر معذرت کہلا بھیجی، دو چار بے فکرے ہی ہی ہا ہا کرنے کے لئے آئے، اُن کو ٹال دیا۔ لیکن وہ حضرت پھر بھی نہ آئے! ــــــ

دو تین چار اسی طرح دس پندرہ دن گزر گئے پیشہ کے

کاموں اور یاروں کی صحبت میں بڑے میاں کا تصور دھندلا ہو چلا ـــــ دس پانچ دن میں بالکل ہی بھول جاتا اگر ایک عجیب تر واقعہ پیش نہ آجاتا جس نے اس معمہ کو اور بھی زیادہ اُلجھا دیا ـــــ

دس پندرہ دن بعد، ایک روز شام کو میں اپنے دو ہم پیشہ دوستوں سے ملنے گیا۔ ایک اُن میں سے بمبئی کے بہت مشہور اور مقدس "حضرت مولانا" اور "پیرومرشد" تھے۔ اور دوسرے ایک جدید قسم کے اڈیٹر۔ میں جب ان "حضرت مولانا" کے مکان پر پہنچا تو وہ دوسرے دوست بھی وہاں موجود تھے ـــــ

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، ہوتے ہوتے کچھ روحانیت کا تذکرہ چھڑ گیا، باتوں باتوں میں مجھے وہ باغ والا واقعہ یاد آگیا میں نے کہا "آپ دونوں صاحبوں کو ایک عجیب واقعہ سُنانا ہوں ایک عجیب واردات ہے مگر مجھ پر ہنسیے گا نہیں، واقعہ بالکل سچا ہے، دماغ میرا بالکل صحیح ہے ـــــ" اس تمہید کے ساتھ میں نے وہ واقعہ بیان کرنا شروع کردیا۔ جب میں نے صبح کے قریب پیرمرد کا کمرہ میں آنا بیان کیا تو اڈیٹر صاحب نے قطع کلام کرکے مجھ سے سوال کیا :۔

"یہ بتائیے کس دن اور کس وقت، ٹھیک ٹھیک بتائیے"

میں نے اُن کو دن اور وقت بتایا اور پھر اپنا قصہ شروع

کہا، پیر مرد کا غائب ہو جانا، صبح کو دفتر میں آنا پھر شام کو آنے کا وعدہ کر کے جانا اور پھر کبھی نہ آنا۔ جب میں یہ قصّہ بیان کر رہا تھا تو دیکھ رہا تھا کہ یہ دونوں صاحب حیران ہو ہو کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے جاتے ہیں اور اُن دونوں کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے بھی ہوتے جاتے ہیں۔

"کس وقت وہ دفتر میں آئے تھے اور کیا گفتگو کی تھی اُنھوں نے؟ ذرا مفصّل فرمائیے" حضرت مولانا نے سوال کیا۔ میں نے وقت بھی بتا دیا اور لفظاً بہ لفظاً گفتگو بھی دُہرا دی۔

"ذرا اُن کا حلیہ تو پھر بیان کیجئے" اڈیٹر صاحب نے فرمائش کی۔

میں نے حُلیہ بھی مفصّل دہرایا۔

"کیا سمجھے آپ" مولانا نے اڈیٹر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ کیا سمجھے؟" اڈیٹر صاحب نے مولانا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"عجیب"! مولانا نے فرمایا۔

"عجیب!" اڈیٹر صاحب نے فرمایا۔

میں حیران ہو کر دونوں کا مُنہ تک رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے شب میں بدہضمی کی وجہ سے خلل دماغ کا دورہ ہوتا ہے تو ان دونوں کو دن میں بھی، یہ شکایت لاحق ہو جاتی ہے!! —

میں نے کہا "کچھ تو فرمایئے، یہ اشارے کنائے کیسے؟"

"کہہ دو"! مولانا نے اڈیٹر صاحب سے کہا،
"کہہ دوں؟" اڈیٹر صاحب نے مولانا کو جواب دیا ـــ

اڈیٹر صاحب سنبھل بیٹھے، اُنھوں نے کہا "سنیئے جناب! یہ عجیب و غریب سا واقعہ ہے، جو واقعہ آپ نے سُنایا بالکل یہی واقعہ مجھ پر گذر چکا ہے، مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میرے پاس بھی وہ پیر مرد ٹھیک اُسی شب میں اُسی وقت آئے تھے جس وقت وہ آپ کے پاس آئے تھے، اور پھر اسی طرح کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہی ہوتے غائب بھی ہو گئے تھے ــــ مگر عجیب تر جو بات ہے وہ یہ ہے کہ صبح کو بھی وہ میرے دفتر میں ٹھیک اُسی وقت اور اسی طرح آپ کے دفتر میں، وہی باتیں اُنھوں نے مجھ سے کہیں جو آپ سے کہیں، اسی طرح مجھ سے وقت مقرر کرا کے گئے جس طرح آپ سے ــــ اور یہ توارد تو دیکھیے کہ میں نے بھی اُسی دن وہی وقت مقرر کیا جو آپ نے مقرر کیا تھا ــــ مگر وہ پھر آج تک لوٹ کر نہ آئے جس طرح آپ منتظر ہیں میں بھی سراپا انتظار ہوں! ــــ اتنا کہہ کر اڈیٹر صاحب نے رومال سے چہرہ کا پسینہ خشک کیا پھر فرمانے لگے: ــــ

"یہ واقعہ دوسرے ہی دن میں نے مولانا سے بیان کر دیا تھا۔

۔ پوچھئے مولانا سے ـــــ میرے آپ کے درمیان ایک خفیف جزو کا بھی کوئی اختلاف نہیں! ـــــ عجیب، عجیب!! ـــــ

ہم تینوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ ـــــ

میں نے کہا: "تصوّر اور توہم کے توارد کی یہ ایک عجیب مثال ہے۔"

"تصوّر اور توہم؟" مولانا نے تعجب کے لہجہ میں فرمایا۔ "تصوّر اور توہم! آپ اس واقعہ کو تصوّر اور توہم سمجھ رہے ہیں۔ نہیں صاحب! نہیں! نہ یہ تصوّر رہا اور نہ توہم نہ توارد! روحانیت کی ایک ماورائے عقل و فہم کارفرمائی ہے! آپ تو مادہ پرست ہیں روح کے ان معجزات اور تصرفات کو کیا خاک سمجھیں گے، لیکن آپ کو قائل ہو جانا چاہیئے ـــــ اب تو قائل ہو جانا ہی چاہیئے کہ اس عالم ظاہر کے علاوہ کوئی باطن بھی ہے جہاں ایسی باتیں بالکل ناممکن ہیں ـــــ"

میں نے کہا "مولانا! دماغ کی اندرونی دنیا میں ایسے عجائبات کا ظہور ناممکن نہیں۔ اس علم کے ماہرین، اس قسم کے واقعات پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں ـــــ"

"خدا کے لئے حضرت!" مولانا نے بگڑ کر فرمایا ـــــ "یہ ماہرین اور مبصرین کا ذکر چھوڑ دیجئے۔ ان کم بختوں نے زندگی تلخ کر دی ہے، روز کلیات قائم کرتے ہیں، روز اُن کو توڑتے ہیں، دیوار میں

بناتے ہیں اور گراتے ہیں عقل کے چکر نے اُن کو کھن چکر بنا دیا ہے "روحانیت" کی لطیف دنیا میں جو کچھ ہوا کرتا ہے اور ہو سکتا ہے اُس کو یہ احمق کیا جانیں ___"

میں نے کہا "خاک ڈالیئے اس بحث پر، مگر یہ تو بتائیے کہ وہ خواجہ خضر جنھوں نے مجھے بھی سونے سے جگایا اور اڈیٹر صاحب کو بھی بہ یک وقت ___ حالانکہ میں اور اڈیٹر صاحب اس وقت ایک دوسرے سے کم از کم ۵ میل کے فاصلہ پر سوئے تھے ___ اور پھر وہ دن میں بھی بیک وقت دونوں کے پاس آئے اور پھر بلا وجہ غائب ہوگئے اور کبھی واپس نہ آئے ___ آخر چاہتے کیا تھے، کوئی اُن کا مقصود بھی تھا یا محض دل لگی تھی ؟ ___"

"کوئی پیام لائے ہوں گے، کوئی بات کہنا چاہتے ہوں گے، یا محض اپنی صورت دکھا کر تمہیں متنبہ کرنا چاہتے ہوں گے ___ یا کوئی اور منشا ہوگا ___ کیا معلوم کسی کو" مولانا نے میرے اعتراض کا اپنے خیال میں بہت ہی مختتم جواب دیا !! ___

بحث کچھ اور بڑھتی لیکن پاس کی مسجد سے اذان کی آواز آئی اور مولانا نماز کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ___

میں اور اڈیٹر صاحب راستے بھر یہی ذکر کرتے ہوئے آئے ___ وہ بھی حیران، میں بھی حیران! "کچھ بھی ہو" میں نے کہا "وہ پیر مرد ہیں بہت ہرجائی !" ___

کباڑ کی کوٹھڑی

"بلاگردان" صاحب کا یہ قصہ تو کچھ
زیادہ عجیب نہیں، لیکن اندازِ بیان
بہت دلچسپ ہے۔ اس لیے فیس
داخلہ قبول کر کے صاحب موصوف
کو انجمن کی رکنیت میں شامل کیا جاتا ہے۔
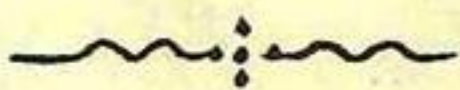
غدر سے پہلے دادا صاحب مرحوم نے وہ مکان بنایا تھا جس میں ہم رہتے ہیں ــــ پُرانا ہے مگر بہت مضبوط ہے! جب غدر شروع ہوا تو دادا صاحب ایک بڑے سرکاری عہدہ پر فائز تھے، مگر آخر میں اُنھوں نے پھانسی پائی! (کوئی پولیس والا نہ سُن لے) الزام یہ تھا کہ اُنھوں نے ایک بھاگے ہوئے دلّی کے شہزادے کی مدد کی تھی وہ بیچارے تو پھانسی پر لٹکے اور اِدھر اُن کی ساری جائداد و املاک بحق سرکار ضبط ہوگئی، ہمارا مکان بھی ضبط ہوگیا۔ دادی بیچاری اس طرح گھر سے نکلیں کہ صرف ایک چادر اُن کے سر پر تھی!! ــــ

دارو گیر کا زمانہ گزر گیا۔ دادی ہماری بڑی اولوالعزم عورت تھیں، کم عمری میں بیوہ ہوکر بھی وہ مصائب سے گھبرانے والی نہ تھیں۔ ڈولی میں بیٹھ کر بڑے صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئیں اور جو کچھ کہنا سُنا تھا صاف صاف کہا۔ صاحب نئے نئے ضلع میں آئے تھے، اُنھوں نے جو تحقیقات شروع کی تو ثابت یہ ہوا کہ دادا صاحب نے بے گناہ پھانسی پائی!! عجلت میں پھانسی پر چڑھا دیئے گئے! ــــ اُس زمانے میں کالے آدمی کی جان کی قیمت صرف اتنی تھی کہ جب یہ حقیقت واضح ہوئی تو سرکار نے بڑا کرم کیا جو کچھ ضبط کیا تھا اس کا نصف واپس کردیا! دادی نے کہا، چلو، بھاگتے

بھوت کی لنگوٹی۔ یہی غنیمت ہے۔ دو سال بعد پھر اپنے بچوں کو لے کر گھر آئیں ـــــ جس وقت گھر بند ہوا تھا تو اوپر کی منزل پر ایک کوٹھڑی تھی اس میں سارے گھر کا کاٹ کباڑ ڈال دیا گیا تھا۔ کوٹھڑی کا ایک ہی دروازہ تھا اس میں تالا پڑا ہوا تھا۔ گھر میں واپس آنے کے بعد بھی وہ تالا اسی طرح پڑا رہا ـــــ یہ سارا قصہ اُس زمانے کا ہے جب میں تو کہاں، میری ماں بھی غالباً پیدا نہ ہوئی تھیں!! یہ نہ سمجھیے کہ میں چشم دید بیان کر رہا ہوں!!

میری پیدائش کے پندرہ برس بعد تک اس کوٹھڑی میں بدستور تالا پڑا ہوا تھا۔ ایک گناہ گار کے سینہ کی طرح اس کے اندر روشنی جانے کا کبھی کوئی راستہ نہ کھلا! مجھے یاد ہے کہ "دادی اماں اس کوٹھڑی کے متعلق عجب عجب قصے سُنایا کرتی تھیں۔ میں جب ۱۲ برس کا تھا تو دادی اماں کی عمر اسّی برس کے قریب تھی۔ وہ فرمایا کرتی تھیں کہ جب غدر میں ہم لوگ اس مکان سے نکال دیے گئے اور دو برس تک یہ مکان خالی پڑا رہا تو اس زمانہ میں ایک بہت نیک خیال جن اس کوٹھڑی میں آکر رہنے لگے اکثر صبح کو اُن کے قرآن شریف پڑھنے کی آواز آتی ہے اور مجھ پر تو اس قدر مہربان ہیں کہ جب کبھی میرا دل گرم گرم مٹھائی یا تازے پھل کھانے کو چاہتا ہے، فوراً بھیج دیتے ہیں!! ـــــ

——— میں بچّہ تو تھا لیکن اُنیسویں صدی عیسوی کا بچّہ تھا! یہ قصّے سنتا تھا اور "دادی اماں" کو اس قدر چھیڑ کہ نہ چڑ جاتی تھیں ——— "کیوں دادی اماں، یہ تمہارے دوست جو اوپر کوٹھڑی میں رہتے ہیں مٹھائی تو لاتے ہیں، کیا ہمارے لئے کرکٹ کا ایک بلّا نہ لادیں گے؟ اچھی دادی اماں! آپ ذرا اُن سے کہئے تو" ——— کیوں دادی اماں بھلا یہ جن صاحب اس کوٹھڑی میں رہتے ہیں تو پاخانہ پیشاب بھی اسی کے اندر کرتے ہوں گے۔ ——— بڑے غلیظ ہیں وہ!" ——— "دادی اماں" کو غصّہ آجاتا تھا کہتی تھیں "توبہ توبہ کر لڑکے! وہ خدا کے نیک بندے ہیں، ہمارے مہمان ہیں ایسی باتیں کرنا ہے تو اُن کے متعلّق ———"

میں کہتا: "دادی اماں! وہ اُڑتے بھی تو ہوں گے ——— ہم نے سُنا ہے کہ سب جن اُڑتے ہیں ——— بھلا اُن سے کہئے ایک دن ہم کو اُڑا کر دلّی لے چلیں ——— حضرت سلیمان کی قسم دیجئے گا تو ضرور مان جائیں گے!"

دادی اماں دِق ہوجاتیں تو اپنی لاٹھی اُٹھا کر مجھے ڈراتیں ——— "نہیں جائے گا تو، نہیں جائے گا؟ بکے جائے گا، بکے جائے گا؟ اچھا ٹھہر تیرے مولوی صاحب آئیں تو دیکھ ہیں کیسا کچھ پٹواتی ہوں ———"

کبھی "دادی اماں" چند چراغ جلا کر ـــــ شام کے وقت ـــــ اس کوٹھڑی کے دروازہ پر رکھ دیتیں اور سب سے کہتیں "دیکھو بچو! اس وقت غل شور نہ ہونے پائے، آج جنات جمع ہیں میلاد شریف کی محفل ہو رہی ہے ـــــ"

میں کہتا "دادی! یہ کیسا میلاد شریف ہے، کوئی آواز تو آتی ہی نہیں! وہ فرماتیں، جا بھاگ! بچوں کو آواز نہیں آیا کرتی! ـــــ"

ایک رات کو ـــــ جاڑوں کا زمانہ تھا ـــــ ہم سب دالان میں سو رہے تھے، دالان کے سب دروازے بند تھے دادی اماں کے پلنگ کے پاس ہی میرا پلنگ تھا، یکایک میری آنکھ کھلی، یہ معلوم ہوا جیسے کوئی میرے پلنگ پر کودا ہو، ڈر کے مارے میری چیخ نکل گئی، سب لوگ جاگ اٹھے، دیکھا تو ایک سفید رنگ کا بلا تھا ـــــ معلوم نہیں کدھر سے آ گیا ـــــ تھا بہت بڑا، بکری کے بچے کے برابر۔ وہ تو ہم لوگوں کے جاگنے کے بعد کسی طرف سے نکل گیا۔ مگر دادی اماں نے صبح تک کسی کو اپنی باتوں سے سونے نہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اوپر والے جن اس وقت بلے کی صورت میں آئے۔ معلوم نہیں مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے؟ بار بار دادی اماں فرماتی تھیں!! ـــــ غرض یہ کہ صبح سے دوپہر تک سارے محلہ میں دادی اماں نے خبر کر دی کہ اب تو کوٹھڑی والے جن خود ہی اُن کے

پاس آنے لگے ہیں!! میں کہتا دادی اماں آپ نے اس وقت اُن کی دم نہ پکڑلی، جانے کیوں دیا؟" وہ مجھے جھڑک دیتیں "چپ، بدتمیز!"
——جن صاحب کے آنے جانے کا سلسلہ بھی عرصہ تک جاری رہا۔
ایک رات کو میری ایک پھوپھی جو اسی دالان میں سو رہی تھیں، سوتے سوتے کسی ضرورت سے اُٹھیں تو اُنہوں نے دیکھا کہ دادی اماں اپنے پلنگ پر نہیں ہیں باہر نکلیں تو دیکھا کہ وہ صحن میں کھڑی بلّے سے کھیل رہی ہیں "دادی اماں نے کہا کہ رات بلّے نے انکو سونے نہ دیا تو ایک دفعہ غصہ میں آکر وہ اس کی کمر پر سوار ہوگئیں، بلّا اُن کو لیکر بھاگا —— صحن سے اُس نے جست کی تو سامنے کی دیوار پر پہنچا تو سامنے کی دیوار سے جست کی تو کوٹھری کی چھت پر پہنچ گیا —— وہاں سے جست کی تو پھر صحن میں —— اور دادی اماں برابر اس کی کمر پر جمی رہیں!! —— میں نے جو یہ قصہ سُنا تو خوب تالیاں بجائیں —— دادی اماں بہت ناراض ہوئیں، مگر میں کئی راتیں اس فکر میں جاگتا رہا کہ اگر سفید بلّا آجائے تو میں بھی ضرور اُس کی کمر پر بیٹھ ہی تو جاؤں!!
"دادی اماں! تم اُن سے کہو" میں نے کہا کہ روز ہمیں سواری دے جایا کریں، آہاہا! کیا مزے کی سواری ہوگی!"
—— اس آہاہا کے جواب میں دادی اماں کا ڈنڈا میری کمر کی طرف آیا —— اور میں بھاگا۔!
غرضکہ جب تک دادی اماں زندہ ہیں وہ ضرور "جن صاحب"

کا کوئی نہ کوئی نیا قصہ ضرور سنایا کرتیں اور میں ضرور کوئی نہ کوئی فقرہ چست کرتا۔
کبھی کبھی ایک دو ڈنڈے بھی کھاتا۔ پھر میں اسکول میں داخل ہوگیا اور چند ہی روز
بعد "دادی اماں" کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد سے "جن صاحب" بھی
غائب ہوگئے۔ کم از کم کوٹھری میں، ان کی موجودگی کے آثار نظر نہ آتے تھے
گرم گرم مٹھائی تھی نہ سفید بلا تھا نہ قرآن شریف پڑھنے کی آواز تھی۔ ممکن
ہے کہ وہ دادی اماں کے ساتھ ہی ساتھ رخصت ہوگئے ہوں۔

بچپن کی ناسمجھی نوجوانی کی شرارتوں میں بدل گئی۔ میں اسکول سے
فارغ ہو کر کالج میں داخل ہوا۔ جوانی دیوانی ہونے لگی۔ والد نے
جو یہ رنگ دیکھا تو میری شادی کا اہتمام شروع کر دیا۔ رشتہ بچپن ہی سے
قائم ہو چکا تھا۔ میری منگنی اس وقت ہوگئی تھی جب میں ۵ برس کا اور میری
بیوی صرف ۲ برس کی تھی! غرض یہ کہ میں نے کچھ انکار بھی کیا! مگر کون
سنتا ہے، پکڑ دھکڑ کے یہ بیل آخرکار زندگی کے ہل میں جوت ہی دیا گیا۔
ہمارا خاندان تھا۔ اس لئے شادی بہت سادہ اور شرعی قسم کی ہوئی۔ شام
کو بارات گئی۔ شب بھر ہم سسرال میں پڑے رہے دوسرے دن شام
تک بیوی کو لیکر گھر آئے۔ لیکن واقعات کے سلسلہ کو توڑ کر پہلے
اس کوٹھری کے متعلق تھوڑا سا قصہ بیان کر دوں۔

جب شادی کا اہتمام شروع ہوا تو والدہ سے میں نے کہا کہ زنانہ
مکان کی بالائی منزل پر میں اپنے لئے ایک ہوادار کمرہ بنوانا چاہتا ہوں اور

کمرہ کے لئے بہترین جگہ وہی ہے جہاں وہ پُرانی کوٹھری ہے۔ والد نے فرمایا کہ بیٹا! تمہاری دادی نے کبھی اُس کوٹھری کے تالے کو ہاتھ نہ لگانے دیا۔ اُن کے بعد بھی میں نے اُس کوٹھری کو بدستور بند چھوڑ دیا۔ بہتر ہو کہ اس کو یوں ہی چھوڑ دو اور کسی اور طرف اپنے لئے کمرہ بنوالو۔ میں نے کہا۔ اب تو یہ سب باتیں فضول ہیں۔ اگر کبھی کوٹھری میں کوئی جن یا بھوت تھا بھی تو وہ بھی اب باقی نہیں، کیا فائدہ کہ کوٹھری کو بند رکھا جائے اور اس قدر موادار موقع کو چھوڑ کر دوسری طرف کمرہ بنایا جائے ـــــ والد خاموش ہو گئے۔ ان انیسویں صدی عیسوی کے بیٹے سے اختلاف ذرا کم ہی کیا کرتے تھے۔ القصہ کوٹھری کا دروازہ کھول دیا گیا۔ غدر سے پہلے کا کاٹ کباڑ۔ ٹوٹے ہوئے پلنگ، بکس، پائے، مٹی کے گھڑے اور خدا جانے کیا کیا۔ پچاس برس کی گرد سے ڈھکا ہوا سامان وہاں سے نکالا گیا، دیواریں گرادی گئیں اور اُسی جگہ نیا کمرہ تعمیر ہو گیا۔

میری ازدواجی زندگی کی یہ پہلی شام تھی۔ وہ شام جس کے متعلق شاعر گیت گاتے ہیں! دُلہن اُسی کمرہ میں بٹھائی گئی تھی، میری بہنیں اُس کے پاس بیٹھی تھیں۔ کمرہ میں پُرانی وضع کی ہانڈیاں لٹک رہی تھیں، دیواروں پر دیوارگیر فانوس لگے ہوئے تھے۔ اسی منزل پر ایک دوسرا کمرہ میری نشست گاہ تھا۔ مغرب کے وقت مجھے وہاں سے بلایا گیا اور کہا گیا کہ ان فانوسوں اور ہانڈیوں کی موم بتیاں روشن کر دوں۔ دُلھن

دیک چاندی کے پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے پلنگ کے پاس ایک کرسی رکھ کر اوپر چڑھا تاکہ ہانڈی کی بتی کو روشن کروں۔ دیا سلائی جلا کر میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دفعتاً یہ معلوم ہوا کہ کسی نے میرے پاؤں کے نیچے سے کرسی کو کھینچ لیا اور میں بے قابو ہو کر دلھن کے پلنگ پر گرا۔ کچھ یوں ہی چوٹ بھی آئی اور خیال یہ ہوا کہ کسی بہن نے شرارت کر کے مجھے گرایا۔ ایک شریر بہن ——— خدا مغفرت کرے ——— ہنسنے لگی۔ "واہ بھائی واہ! اس قدر بے صبری! انہیں اس پلنگ پر بیٹھنے سے منع کس نے کیا تھا جو یہ بہانہ نکالا۔" اب تو یقین ہو گیا کہ شرارت کی گئی ———
پھر کرسی پر چڑھا اور پھر دیا سلائی جلا کر موم بتی جلانے کا ارادہ کیا ——— اور پھر وہی حشر ہوا آیا، اس دفعہ کچھ چوٹ بھی زیادہ لگی۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ کرسی بدستور اپنی جگہ پر موجود تھی۔ حالانکہ مجھے صاف یہ محسوس ہوا تھا کہ کرسی ہٹائی گئی۔

"یہ کیا بے موقع مذاق ہے؟" میں نے بگڑ کر کہا۔ میری بہنوں نے قسمیں کھائیں کہ انہوں نے کوئی شرارت نہیں کی۔ پھر میں کرسی پر چڑھا، دیا سلائی جلا کر ہاتھ میں نے بتی کی طرف بڑھایا لیکن نیچے کی طرف بھی دیکھتا رہا ——— سب لڑکیاں کرسی سے کافی فاصلہ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مگر پھر میں گرا اور اس دفعہ بالکل دلھن کے اوپر! ——— جھلا کر میں نے دیا سلائی کی ڈبیا پھینک دی اور باہر چلا گیا۔
اسی شب کو ۹ بجے کے قریب میں پھر اندر گیا، میری بہنیں چلی چکی

تھیں۔ میری بیوی کے پاس صرف ایک ماما بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی اُٹھ کر چلی گئی
ہم نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا اور ایک دروازہ کے پاس آرام کرسی بچھا کر
حقہ پینے لگا ۔ گلابی جاڑوں کا موسم تھا۔ کمرہ کے تین دروازے تھے
دو بند تھے ۔ کمرہ کے سامنے غسلخانہ تھا، میری بیوی غسلخانہ جانے
کے لئے اٹھیں اور میری کرسی کے سامنے سے گزر کر باہر چلی گئیں، چند
منٹ بعد وہ واپس آئیں تو میں نے اُن سے کہا کہ دروازہ بند کرتی آؤ، انہوں
نے چوکھٹ سے گذر کر بغیر منہ موڑے ایک ہاتھ سے کواڑ بند کر دیا اور
ساتھ ایک قدم آگے بڑھیں۔ اگر وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ گئیں ہوتیں
تو معلوم نہیں کس قدر زخمی ہوتیں اس لئے کہ کواڑ بند ہوتے ہی یہ معلوم
ہوا کہ گویا باہر سے کسی نے دونوں کواڑوں پر پوری قوت سے ایک لات
ماری، اور کواڑ دفعتاً کھل گئے۔ خیریت گزری کہ میری بیوی چشم زدن
پہلے اُن کی زد سے نکل چکی تھیں! ۔ پھر وہ دھڑاکے کی آواز ۔
سارا مکان گونج گیا! ۔ میں گھبرا کر اٹھا، سمجھا کہ آندھی کا کوئی
جھونکا آیا۔ آسمان کی طرف دیکھا تو بالکل صاف تھا۔ چاندنی کھلی ہوئی
تھی۔ سامنے کی چھت بہت وسیع تھی۔ خیال آیا کہ شاید نیچے کی منزل
سے کسی شریر لڑکی نے آکر یہ مذاق کیا ہو ۔ لیکن زینہ اس قدر دُور
تھا ۔ اور بالکل سامنے کہ کتنا ہی تیز کوئی آتا جاتا چھپنا مشکل تھا اور
پھر اس کھلی ہوئی چاندنی میں! چھت پر ایک چکر لگا کر میں واپس آیا۔ کوئی
بات سمجھ میں نہ آئی ۔ بہر حال کواڑ بند کر کے اور ۱۱ بجے کے قریب

سو گیا — میری آنکھ جھپکے شاید دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہونگے کہ پھر دروازہ پٹنا شروع ہوا۔ گھبرا کر اٹھا دروازہ کھولا، باہر گیا — ہر طرف دیکھا — چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ ساری چھت صاف تھی، ہوا کا نام نہ تھا۔ کوئی ایسا راستہ نہ تھا کہ غیر شخص آسکتا، زینہ کا دروازہ بیں نے پہلے ہی اندر سے بند کر لیا تھا، وہ بدستور بند تھا — پھر سو گیا، ذرا آنکھ لگی تھی کہ پھر کواڑ پٹنے شروع ہوئے، پھر اٹھا، پھر سویا، پھر جاگا، رات بھر اسی طرح چوکیداری کرتے گذری، جب تک جاگتا رہتا تھا کوئی کھٹکا نہ ہوتا تھا جہاں آنکھ لگی اور کواڑ پٹنے شروع ہوئے، ساری رات تو اسی طرح گذر گئی، بیوی سے بیں نے منع کر دیا کہ اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ دوسرے دن کمرہ کے باہر برآمدہ میں، دروازہ کے پاس دو کتے باندھے گئے۔ زینہ کا دروازہ بند کر کے تالا ڈالا گیا۔ بارہ بجے تک بیں بیٹھا ہوا بیوی سے باتیں کرتا رہا — وہ ڈر تو بہت رہی تھیں لیکن اپنا خوف ظاہر نہ ہونے دیتی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے ہم لوگ سو گئے — پندرہ ہی منٹ کے بعد پھر کواڑ پٹنے شروع ہو گئے اور یہی حال رات بھر رہا۔ کتے دروازہ کے سامنے بیٹھے تھے اور صرف اسی وقت بھونکتے تھے جب کواڑ پٹنے کی آواز شروع ہوتی تھی! یقیناً وہ کسی کو دروازہ کے پاس آتا نہ دیکھتے تھے! — پھر یہ معمہ کیا تھا؟

ایک دن، دو دن، چار دن، ــــ ایک ہفتہ اسی طرح گذر گیا
رات کی نیند حرام ہو گئی ـ میں نے اور میری بیوی نے بہت اس
قصہ کو چھپایا لیکن کہاں تک، بہنوں تک بات پہنچی، پھر والدہ کو معلوم
ہوا، پھر والد کے کان تک سارا قصہ پہنچا اور ہوتے ہوتے ہماری ساس
کو خبر لگی ــ وہ بے چاری پرانے زمانہ کی بڑی بی، سنتے ہی ڈولی پر
چڑھ کر دوڑیں ــــ سارے گھر میں قیامت آ گئی۔

"غضب خدا کا! پہلے دن سے یہ ظلم ہو رہا ہے میری بچی کو مار
ڈالنے کا ارادہ ہے کچھ؟ اور یہ میاں لڑکے تو پاگل معلوم ہوتے ہیں،
مجھے کیا خبر تھی کہ داماد پاگل ملا ہے ــــ بند کرو، اس کمرہ کو، صاحبزادے
نیچے کی منزل میں رہنا چاہیں تو رہیں نہیں تو میں تو اپنی بچی کو لئے جاتی
ہوں ــ کیا کہا؟ نیچے تکلیف ہو گی؟ کیا تکلیف ہو گی؟ تمہارے
باپ دادا سب یہیں رہے، تم یہیں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی ـ
ہمیشہ کمرہ پر ہی تو رہا کرتے تھے گویا! ــــ چلو جھک جھک نہ کرو
ــــ رہیں رہو گے تو رہو، میں تو اپنی بچی کو لئے جاتی ہوں،
ــــ اللہ بچائے آج کل لڑکوں سے ــ دیدہ کی صفائی تو دیکھو
ــــ جنات سے مقابلہ کریں گے یہ! اپنی دادی کی باتوں پر ہنسا
کرتے تھے۔ اس وقت تو میاں بالشت ہی بھر کے تھے ــــ اب
مجھ سے دل لگی کرنے لگے! ــ جو تمہارے جی میں آئے کرو ــ"
ایک لمبا چوڑا لیکچر دے کر وہ تو میری کو لے کر گھر چلی گئیں، اب

اماں باوا کی یورش مجھ پر شروع ہوئی ــــ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا سخت ترین مقابلہ ہوا۔ مگر میں نے کسی کی نہ سنی۔ تنہا بھی وہیں سویا ــ اتنا تو ہوا کہ ابا جان نے بغیر میری اطلاع کے دو نوکر برابر کی چھت پر بٹھا دیا۔ لیکن رات کی دھڑادھڑ کو وہ بھی نہ روک سکے، سلسلہ برابر جاری رہا ــ میں بھی اپنے سرہانے طلسم ہوشربا اور رینالڈس کے ناول رکھ کر لیٹتا تھا اور تین چار بجے صبح تک پڑھتا تھا۔ اس لئے صبح کے قریب جب آنکھ لگتی تھی تو ایک دو دفعہ سے زیادہ کواڑ پٹنے کا موقع نہ آتا تھا۔ اس طرح دو ہفتے گذر ے ایک دن میں نے کہا چھوڑو میں نہیں سوتا کمرہ میں، کواڑ کھول دو اور دروازہ کے سامنے برآمدہ میں بستر بچھاؤ ــــ وہ شب امن سے گزری، اس کے بعد کبھی یہ سلسلہ جاری نہ ہوا ــ بلکہ میں جب پھر اندر سونے لگا اور تب بھی وہ واقعہ پیش نہ آیا۔ ساس صاحبہ کو جب کافی اطمینان ہو گیا تو انہوں نے بھی بہت سے تعویذ پہنا کر اور بہت فلیتے کمرہ میں جلانے کے لئے ساتھ کر کے میری بیوی کو بھیج دیا۔

۱۸ برس تک ہم اس کمرہ میں رہے، گرمی، جاڑا، برسات، تمام موسم وہیں گزرتے تھے میرے بچے بھی وہیں رہتے تھے ــــ معلوم ہوتا تھا کہ دادی اماں کے وہ روحانی دوست ناراض ہو کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

اب یہ نہ پوچھئے کہ میری رائے کیا ہے اور اس سارے

واقعہ کی اصلیت میں کیا سمجھتا ہوں ! جنات کے متعلق بد عقیدہ میں
اب بھی ہوں۔ اب بھی میں ان باتوں کو ڈھکوسلا ہی سمجھتا ہوں لیکن
اگر آپ مجھ سے یہ دریافت کریں کہ آخر دو ہفتے تک میرے کواڑ
کون پیٹا کرتا تھا تو میں جواب کچھ نہ دے سکوں گا البتہ آپ سے
کہوں کہ جدید روحانیات کے یورپین ماہرین سے مشورہ کیجئے !
بغیر یورپین ماہرین کے مشورہ کے اس الجھیڑے کا بھی ـــ سلجھنا مشکل
ہے ! تعلیم یافتہ متمدن اور "روشن خیال" آدمی ہوں ـــ علم و
سائنس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ جنات ونات سب پرانی
بوڑھیوں کے ڈھکوسلے ہیں۔

شاہ جمال

مجلس کی رائے میں "جمالی" صاحب
کا یہ بیان کافی دلچسپ ہے۔ لہٰذا
بطور فیس داخلہ منظور کیا جاتا
ہے ⁂

لوگ مجذوب کہتے تھے میں ان کو پاگل کہا کرتا تھا، اصل نام تو اُن کا کچھ اور ہی تھا مگر میں ہمیشہ اُن کو "شاہ جمال" کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں کسی ریاست میں بہ تلاشِ روزگار مقیم تھا، لیکن کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ ایک دن یہ حضرت وہاں پہنچ گئے میرے ہی پاس قیام کیا۔ ان کا قیام بھی سفر سے بدتر ہوتا تھا، تشریح آگے کروں گا۔ غرض دو چار دن حسب عادت شہر میں چکر لگاتے پھرتے، ایک دن ریاست کے ایک بڑے عہدہ دار کے دفتر میں گھس گئے۔ چپراسی اور سپاہی ہاں ہاں ہی کرتے رہے اور وہ دفعتاً عہدہ دار کے کمرہ میں گھس کر اُس کی خالی کرسی پر جا بیٹھے ــ اور لگے احکام جاری فرمانے! یہ تو سب نے سمجھ لیا کہ کوئی پاگل ہے مگر اتنی ہمت کسی کی نہ ہوئی کہ زبردستی اُن کو کرسی پر سے گھسیٹ لیتا۔ صاحب کرسی اُس وقت تک تشریف نہ لائے تھے۔ اول تو شاہ صاحب نے پیشکار کو بلا کر حکم دیا کہ لکھو ہمارا حکم ــ جب اُس نے اس پاگل پن شریک ہونے سے گریز کی تو خود ہی قلم اٹھا کر آپ نے ایک حکم لکھ ڈالا ــ افسر موجودہ برخاست اور اُس کی جگہ نیا تقرر ــ یعنی میرا!۔

نام پتہ نشان سب لکھ آئے ــــ آتے ہی فرمانے لگے ۔ آج تمہارا تقرر کر دیا ہم نے ۔ میں نے کہا ــــ "شاہ صاحب خدا جانے کہاں خاک اڑاتے پھرتے ہو اور باتیں کرتے ہو ایسی جن کا سر نہ پیر" کہنے لگے ہم تو حکم لکھ آئے

کھانا کھا کے وہ تو مجھ سے ایک روپیہ لیکر ــــ اس کی تشریح بھی بعد میں کی جائے گی ــــ پھر گشت میں نکل گئے میں تھوڑی دیر قیلولہ کرنے کے لئے لیٹا ذرا آنکھ ہی لگی تھی کہ کسی نے مجھے ہوشیار کیا۔ دیکھتا ہوں تو وزارت کا ہرکارہ کھڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ مجھے رئیس نے یاد فرمایا ہے ــــ قصہ مختصر یہ کہ اسی دن اور اسی عہدہ پر جس کی خبر شاہ صاحب لائے تھے میرا تقرر ہو گیا ــــ ہز ہائی نس کسی وجہ سے ناراض ہوئے اور موجودہ عہدہ دار کو انہوں نے یکا یک برطرف کر دیا ــــ اس واقعہ کا بڑا چرچا ہوا ہز ہائی نس کے کان تک یہ قصہ پہنچا، اُن کو شاہ صاحب سے ملنے کا شوق پیدا ہوا ــــ شاہ صاحب کہاں ہاتھ آنے والے تھے ــــ دس پندرہ دن کے بعد معلوم ہوا کہ بمبئی میں چوپاٹی پر گھوم رہے تھے، پھر چند روز بعد معلوم ہوا کہ اپنے وطن پہنچ گئے ــــ اب شاہ صاحب کا تھوڑا سا حال بھی سن لیجئے ــــ

میرے وطن میں علماء کے ایک بہت مقدس خاندان کے

رکن تھے۔ خود بھی عالم و فاضل آدمی تھے، درس نظامی کی تکمیل کر چکے تھے، فارسی خوب بولتے اور لکھتے تھے اور طب کی تمام ضروری کتابیں بھی پڑھ چکے تھے۔ علم و فضل اور زہد و اتقا کی دولت کے علاوہ دولتِ دنیا سے ہمیشہ محروم رہے۔ ابتدائی عمر میں لڑکے پڑھاتے تھے بعد کو ایک بیوہ بیگم صاحبہ کے مختارِ عام اور مہتمم جائیداد ہو گئے تھے۔ غالباً پچاس روپے مہینہ پاتے تھے، جنون، مراق یا اسی قسم کے کسی دماغی مرض کا کوئی اثر خاندان میں نہ تھا، وہ خود نہایت پرہیزگار اور بہت سنجیدہ مزاج آدمی تھے، سفید براق داڑھی، پستہ قد، تسبیح ہاتھ میں ــــــ یہ اُن کی وضع قطع تھی۔ میں اپنی نوعمری کے زمانے میں اکثر ان کو جاتے آتے دیکھا کرتا تھا، سلام دعا بھی ہوتی تھی لیکن اس سے زیادہ مراسم کچھ نہ تھے ــــــ اُن کا جوان لڑکا یکایک پاگل ہو گیا۔ اس پر جنون کے دورے بہت شدید پڑتے تھے اس لئے گھر میں باندھ کر ڈال دیا گیا تھا، شاہ صاحب اس کی تیمار داری کیا کرتے تھے، ایک دن اس لڑکے نے بیٹھے بیٹھے پانی کے ایک مٹکے کی طرف اشارہ کیا اور باپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"ایک دفعہ سر مارتا ہوں، ٹکڑے ہو جائیں گے اس مٹکے کے، سمجھا کچھ؟ بڈھے! ــــــ یہ دیکھ!"

"یہ دیکھ" کہہ کر جو مٹکے پر سر مارا ہے تو اس کے چار ٹکڑے ہو گئے۔ دفعتاً شاہ صاحب کے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔

"الّو! یہ کیا بہادری ہوئی! دیکھ پہلوانی اس کو کہتے ہیں سر مار کر دیوار گرا دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے دیوار پر زور سے سر مارا۔ چوٹ تو آئی ہوگی مگر سر پھٹا نہیں، نہ دیوار گری ـــ البتہ دیوار تھی بہت، دو چار اینٹیں گر گئیں مگر شاہ صاحب کے پاگل پن کا اسی دن سے اعلانِ عام ہوگیا ـــ اب گھر میں ایک کی بجائے دو پاگل ہو گئے۔ شاہ صاحب اس پاگل پن کی حالت میں اپنی بیوی سے بہت ڈرا کرتے تھے ـــ ہمیشہ ان کو ملانی بی کے نام سے یاد کیا کرتے تھے، بڑی بی کی موجودگی میں پاگل پن کی حرکتیں کچھ کم ہو جاتی تھیں ـــ ایک دن ملانی بی کی نگرانی اور نکتہ چینی سے گھبرا کر نکل کھڑے ہوئے ـــ عجیب بات یہ ہوئی کہ جس دن یہ پاگل ہوئے اسی دن اُن کا بیٹا بالکل صحت یاب ہوگیا۔ اب بھی موجود ہے اور ہر طرح صحیح الحواس ہے ـــ مگر شاہ صاحب اُس دن سے جو بگڑے تو پھر کبھی نہ سنبھلے!

طبعاً میں پاگلوں اور دیوانوں سے بہت خوفزدہ رہتا ہوں۔ چنانچہ جب شاہ صاحب نے کپڑے پھاڑ کر سڑکوں پہ دوڑنا اور چیخنا چلّانا شروع کیا تو میں نے اپنے ملازموں کو ہدایت کر دی کہ شاہ صاحب ادھر آئیں بھی تو میرے مکان کے اندر نہ آنے دینا ـــ لیکن جب سے وہ پاگل ہوئے مجھ پہ خاص توجہ فرمانے لگے، دوسرے

تیسرے دن میرے محلہ میں اُن کا پھیرا ہوتا۔ آگے آگے چلاتے، پکارتے، چیختے شعر پڑھتے، گالیاں دیتے، تالیاں بجاتے شاہ صاحب اور ان کے پیچھے پیچھے دس بیس لونڈے تالیاں بجاتے ہوئے اور محلہ کے دو چار کتے بھونکتے ہوئے۔ اس طرح شاہ صاحب کا جلوس میرے گھر کی طرف آیا کرتا تھا! میرا یہ حال کہ جہاں میں نے ان کی آواز سنی اور مکان کے دروازے بند کرائے۔ ایک دفعہ تو یہ ہوا کہ وہ کسی طرح گھس ہی آئے۔ میں اُٹھکر بھاگا تو سیدھا پاخانہ میں۔ اور اندر سے کر لئے کواڑ بند۔ اب شاہ صاحب میری نشست کے کمروں میں دوڑ رہے ہیں۔ قلم دوات کو خراب کیا، کاغذات پھاڑ ڈالے، کتابیں نکال کر پھینک دیں، دو چار اردو فارسی کی کتابیں بغل میں دبائیں، دو چار تصویریں دیواروں پر سے اتار کر پھاڑ ڈالیں۔ دو گھنٹے تک انہوں نے مکان میں یہ ہنگامہ برپا رکھا اور میں پاخانہ میں چھپا بیٹھا رہا! اس قدر خوفزدہ تھا کہ ایک دفعہ تو اُن کو پاگل خانہ میں داخل کرانے کی کوشش بھی کی۔ شاہ صاحب کو دو باتوں کا بہت شوق تھا۔ ایک تو موٹر میں سوار ہونے کا اور دوسرے خطوط لکھنے کا۔ کسی کی موٹر جاتی ہو کسی نہ کسی طرح اس میں سوار ہو جاتے تھے۔ کبھی کسی والیِ ریاست کے نام، کبھی کبھی کسی والیِ ریاست کے نام، کبھی اپنے کسی عزیز کے نام اور کبھی ملانی بی کے نام!!

ایک دن میں گھر سے باہر جانے والا تھا، میری موٹر مکان کے دروازہ پہ کھڑی تھی۔ خیال و گمان بھی نہ تھا کہ شاہ صاحب اس طرح چپ چپاتے آجائیں گے لیکن جیسے ہی میں نے موٹر میں قدم رکھا شاہ صاحب بھی

نمودار ہو گئے اور بلا تکلف موٹر میں سوار ہو گئے۔ پہلے تو میرا ارادہ ہوا
کہ بھاگوں، ایسا نہ ہو کہ یہ مار بیٹھیں یا کاٹ کھائیں۔ پھر یہ دیکھ کر سڑک
پر بہت سے لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ اپنی بزدلی کا عملاً اظہار کرتے
شرم آئی۔ اب میں نے چاہا کہ شاہ صاحب سے ایسی باتیں کروں کہ یہ خفا
نہ ہونے پائیں۔ میں نے کہا "شاہ صاحب کہیں ہوا خوری کے لئے چلئے
گا؟" انہوں نے فرمایا "چلو ذرا جنگل کی طرف چلیں!" جنگل کے نام
سے میرا خون اور بھی خشک ہوا، خیر اپنے شوفر کی موجودگی سے کچھ
ہمت بندھی۔ میں نے کہا چلئے۔ چنانچہ موٹر شہر کے باہر ایک سبزہ
زار میں جا کر ٹھہرائی گئی۔ شاہ صاحب نے کہا آؤ ذرا ٹہلیں۔
میری یہ حالت کہ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں
مزاج برہم نہ ہو جائے۔ اس لئے شوفر کو اشارہ کیا کہ وہ بھی ساتھ
ساتھ آئے۔ شوفر نے بھی اندازہ کر لیا کہ آج اُس کے آقائے
نامدار کا حال بہت پتلا ہے ـــــ بہر حال کچھ دُور جا کر شاہ
صاحب سبزہ زار پر بیٹھ گئے ـــــ میں بھی بیٹھ گیا ـــــ نہ بیٹھتا
تو کرتا کیا ـــــ دو گھنٹے تک ہم دونوں وہاں بیٹھے رہے، شاہ
صاحب کو فارسی اشعار ہزارہا یاد تھے، سنانے جو شروع کئے
تو تھوڑی دیر بعد اُن اشعار کی لذّت میں اپنے خوف کو بھول گیا
ایک سے ایک بہتر شعر وہ سُنا رہے تھے اور میں مزے لے رہا تھا۔
سارا سماں بدل گیا، ساری فضا بدل گئی ـــ اب جو ہم وہاں سے

اُٹھے تو خوف کا اثر میرے دل پر کچھ یوں ہی سا باقی تھا ــــ بلکہ شاہ صاحب کے لئے اپنے اندر ایک عجیب کشش پاتا تھا ــــ وہ دن ہے اور آج کا دن، شاہ صاحب سے خوفزدہ ہونے کا تو ذکر ہی کیا میں اکثر اُن کو ڈانٹ ڈپٹ لیتا تھا۔ جہاں انہوں نے کوئی غیر سنجیدہ بات منہ سے نکالی یا گالی بکی اور میں نے ٹوکا "شاہ صاحب ہائیں ہائیں یہ کیا بے عنوانی آپ نے شروع کی ہے" ــــ میرے یہ کہتے ہی وہ سنبھل جاتے تھے۔ اکثر اُن کے سخت طیش اور غصہ کی حالت کو میں دو منٹ میں ٹھنڈا کر دیا کرتا تھا۔ میری مجلس میں کبھی کوئی شخص اُن کو اتنا دق نہیں کرتا تھا کہ غصہ آجائے تو غصہ کو ضبط کر کے کہتے تھے۔ "بھئی میں ان سے ڈرتا ہوں ــــ اس لئے کچھ نہیں بولتا ــ"

جنون کی شدت میں داڑھی بھی کٹوا دی تھی اور اکثر کپڑے بھی اتار کر پھینک دیتے تھے لیکن جب سے میرے اُن کے مراسم پیدا ہوئے، کبھی میں نے اُن کو برہنہ نہیں دیکھا۔ جنون کی حالت میں بھی نماز اور روزہ کی سختی سے پابندی کیا کرتے تھے اور یہ ایک عجیب بات تھی کہ جس وقت تک مصلے پر بیٹھے رہتے جنون کے بالکل مفقود ہوتے تھے ــــ میں اکثر مذاق میں اُن سے کہا کرتا تھا "بھئی تم مکر کرتے ہو اور دنیا والوں کو دھوکہ دیتے ہو پاگل واگل کچھ بھی نہیں ہو۔ خواہ مخواہ بنتے ہو!" ــــ دیوانہ باش

تاغم تو دیگراں خورند پرعمل کرتے ہو شاید! ——

میری مرحومہ بیوی زچہ خانہ میں بیمار تھیں، حالت اندیشہ ناک تو نہ تھی لیکن میں پریشان بیٹھا ہوا تھا، شاہ صاحب تشریف لے آئے —— بہت خاموش اور رنجیدہ تھے —— میں نے مزاج پوچھا کہنے لگے، طبیعت مضمحل ہے۔ میں نے کہا "شاہ صاحب! میری بیوی بیمار ہیں آپ ہی کچھ دعا کیجئے" جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر میں اٹھ کر لکھنے کی میز پر جا بیٹھے، خدا جانے کیا کیا لکھتے رہے۔ میں زنانہ مکان میں گیا تو وہ اٹھ کر چل دیئے۔ باہر آیا تو جا چکے تھے۔ میز کے پاس آیا تو میرے جاذب پر نیلی پنسل سے لکھا ہوا تھا "صحبت یار آخر شد" —— تیسرے دن میری بیوی کا انتقال ہوگیا! اس عرصے میں وہ نہیں آئے۔ دفن کے وقت قبرستان میں آئے۔ پھر وہاں سے میرے ساتھ قبرستان ایک رومال میں سوکھی ہوئی ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا تھا مجھے دیا کہ کئی وقت سے تم نے کچھ کھایا نہیں، اس کو کھا کر ٹھنڈا پانی پیو اور خدا کا شکر ادا کرو۔

شاہ صاحب کا بہت ہی محبوب مشغلہ —— جس میں دن کا وہ زیادہ حصہ صرف کرتے تھے یہ تھا کہ صبح کو بازار میں پہنچے اور دکانداروں سے انہوں نے اپنا ٹیکس وصول کیا۔ لوگ اُن سے ڈرتے بھی تھے اور اُن کی خاطر مدارات کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے، اس لئے اُن کی

فرمائش کو رد کوئی نہ کرتا تھا۔ پہلے انہوں نے مٹھائی والے سے تھوڑی سی مٹھائی لی، میوہ فروش سے دو چار پھل لیے، بسکٹ والے سے دو چار بسکٹ، چنے والے سے چنے، گزک والے سے کچھ گزک، ترکاری کی دکان سے کچھ ترکاری ——— غرض ہر چیز اُن کے کرتہ کے دامن میں جمع ہوتی گئی، جب دامن بھر گیا تو وہ اب بازار سے محلوں کی طرف غل مچاتے ہوئے آئے، ہر محلہ کے لونڈے شاہ صاحب کی آواز پر لگے ہوئے تھے، وہ آواز سنتے ہی جمع ہو گئے اور پھر شروع ہوئی لوٹ! اوّل تو شاہ صاحب نے دامن کا سامان تقسیم کرنا شروع کیا اور لونڈوں نے اس کو لوٹنا، پھر شاہ صاحب نے گالیاں دینی شروع کیں، لونڈوں نے آوازے کسنے شروع کئے، دو چار نے موقعہ پر شاہ صاحب کے گھٹے ہوئے سر پر دس پانچ چانٹے بھی مار دیئے ——— گھنٹہ دو گھنٹہ یہ ہنگامہ رہا ——— اسی میں دوپہر کا وقت ہو گیا، شاہ صاحب کسی بھلے آدمی کے گھر پہنچے "کھانا کھلاؤ گے کچھ؟ کیوں بھئی کھلاؤ گے؟" انہوں نے باطمینان بیٹھ کر ماحضر کھایا ——— عادت یہ تھی کہ ہر نوالہ پر بسم اللہ کہا کرتے تھے اور رکابی کو آخری نوالہ سے اس قدر صاف کر دیتے تھے کہ وہ بالکل دھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی ——— کھانا کھا کر شاہ صاحب نے دوسری فرمائش کی، دو روپیہ، ایک روپیہ، آٹھ آنے، جو جی میں آیا مانگ بیٹھے عموماً میزبان کی حیثیت دیکھ کر مانگا کرتے تھے۔ اس طرح جو کچھ ملا اُس کے انہوں نے پیسے بھنائے۔ وہ سب پیسے دامن میں بھر لیے گئے۔ اب

پھر محلوں کا دورہ شروع ہوا۔ پھر اسی طرح تمام پیسے لونڈوں کو تقسیم کیے گئے ــــ کچھ لونڈوں نے چپت مارے، کچھ شاہ صاحب نے گالیاں دیں ــــ چیختے چلاتے میرے گھر آئے ــــ "ارے میاں لونڈوں نے ہم کو بُری طرح مارا ہے، دیکھو نا، سر پر کتنا بڑا گومڑا ہے! مردود نے لکڑی ماری ــــ" میں کہتا "شاہ صاحب! پھر آپ بھی تو باز نہیں آتے، لونڈوں ہی میں جا کر گھستے ہیں ــــ یہ ہر روز کا پروگرام تھا!

ایک دن بعد مغرب کہیں سے آئے، میں اُس وقت زنانہ مکان میں تھا اور میری لڑکی سخت درد قولنج میں مبتلا تھی ــــ جب یہ معلوم ہوا کہ میں زنانہ میں ہوں تو خلافِ معمول اندر آ گئے ــــ دروازہ ہی سے مجھے پکارتے ہوئے ــــ ارے بھائی! خیر تو ہے، کون بیمار ہو گیا ــــ دوا میرے ہاتھ میں تھی، لڑکی کو میں پلانا ہی چاہتا تھا کہنے لگے ــــ ٹھہرو، ٹھہرو! ذرا سا یہ سیب تو کھلا دو۔ ایک آدھا سیب اُن کے ہاتھ میں تھا۔ میں ذرا جھنجھلایا۔ میں نے کہا! "بہت تکلیف ہے لڑکی کو شاہ صاحب اور سیب قابض ہوتا ہے"۔ مگر شاہ صاحب نے ایک ٹکڑا توڑ کر لڑکی کے منہ میں دے ہی دیا ــــ بچپن سے میری لڑکی شاہ صاحب کی بہت معتقد تھی اور اُسے اعتقاد اپنی ماں سے ورثتاً ملا تھا ــــ دوا چھوڑ کر اس نے وہ آدھا سیب ختم کیا اور شاہ صاحب اُس کی پائنتی بیٹھ گئے ــــ میں نہیں جانتا کیونکر اور کس طرح

——— لیکن واقعہ یہ ہے کہ درد اُسی وقت رفع ہو گیا اور صبح تک لڑکی بالکل تندرست ہو گئی ——— اب پیر پرست تو کہیں گے کہ کہ یہ شاہ صاحب کا روحانی فیض تھا اور مجھ سے مادہ پرست کہینگے کہ درحقیقت درد بند ہونے ہی والا تھا۔ ڈاکٹر کی دوائیں اپنا اثر کر چکی تھیں ——— شاہ صاحب کے سبب کو اس واقعہ سے کیا علاقہ ! ——— بہر حال باپ تذبذب ہی میں رہا لیکن بیٹی کی عقیدت مندی شاہ صاحب کے ساتھ ہزار گنی بڑھ گئی ! ——— شاہ صاحب کو سفر و سیاحی کا بھی بہت شوق تھا، دس یا پنچ دن ایک ہی جگہ ٹھہرنا ان کے لئے بہت مشکل ہوتا تھا۔ جس دن جی چاہا ریل کے اسٹیشن پر پہنچے اور جو ٹرین کھڑی ہوئی ملی اُسی میں بیٹھ ہو گئے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ کہاں جائے گی یا شاہ صاحب کہاں پہنچ جائیں گے، ریلوے کے محکمہ میں شاہ صاحب خوب مشہور تھے اور ریلوے کا ہر افسر ان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ریلوے کے متعلق ان کا ایک واقعہ مشہور ہے ——— کانپور کے اسٹیشن کا ایک افسر اعلیٰ بہت سخت مزاج تھا۔ شاہ صاحب بغیر ٹکٹ سفر کر رہے تھے ——— کان پور کے اسٹیشن پر پکڑے گئے۔ انہوں نے حسب عادت بہت شور مچایا۔ ٹکٹ کلکٹر ان کو اس افسر کے روبرو پکڑ کر لے گیا، وہاں بھی انہوں نے وہی بے سر و پا باتیں شروع کیں۔ وہ غالباً یہ سمجھا کہ یہ خواہ مخواہ پاگل بن کر گلو خلاصی چاہتے ہیں ——— حکم دیا کہ پولیس کی سپرد کر دو ——— اس کے کمرہ سے پولیس

کے سپاہی شاہ صاحب کو پکڑ کر لے چلے۔ جاتے جاتے انہوں نے اُنہوں نے افسر مذکو مخاطب کر کے کہا "ارے کیوں ہمیں پکڑواتا ہے تیری ترقی کا حکم تو آ گیا" ـــــ غرض شاہ صاحب ریلوے کے تھانہ میں بٹھا دیئے گئے۔ اس واقعہ کے آدھ ہی گھنٹے کے بعد اُس افسر کو ایک سرکاری تار موصول ہوا جس میں اُس کی غیر متوقع ترقی کی خبر تھی ـــــ تار پڑھ کر وہ سیدھا پولیس کے دفتر میں آیا۔ شاہ صاحب سے معذرت کی۔ اُن کو اپنی کوٹھی پر لے گیا اور بہت خاطر و مدارات کی ـــــ اُس دن کے بعد سے شاہ صاحب کانپور کی طرف گذرتے وہ افسر شاہ صاحب کی بے حد خاطر و مدارات کرتا۔ یہ واقعہ تمام ریلوے کے محکمہ میں مشہور ہو گیا اور شاہ صاحب اس قدر مشتہر ہو گئے کہ ہر اسٹیشن پر لوگ اُن کی آؤ بھگت کرنے لگے۔

اسی طرح ایک دفعہ شاہ صاحب دلی کے اسٹیشن پر کسی ٹرین میں سوار ہونا چاہتے تھے مگر ٹکٹ کلکٹر نے پکڑ لیا اور ٹرین روانہ ہو گئی۔ شاہ صاحب نے بہتیرا غل مچایا مگر اُس نے نہ چھوڑا۔ ٹرین اسٹیشن سے گذر کر دفعتاً رُک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن خراب ہو گیا ہے آدھ گھنٹے تک انجن خراب رہا۔ اتنے میں شاہ صاحب ٹکٹ کلکٹر کی آنکھ بچا کر ٹرین میں سوار ہو گئے اور انجن بھی ٹھیک ہو گیا ـــــ لوگوں نے اس واقعہ کو بھی شاہ صاحب کے روحانی

اثمات سے منسوب کر دیا۔ لیکن "عقل" کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو
انجن کے پرزوں کو "روحانیت" سے کوئی تعلق بھی نہیں ـــــ
بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو اس قسم کے اکثر واقعات نے ریلوے
پر شاہ صاحب کا سکہ بٹھا دیا۔ پشاور سے کلکتہ اور بمبئی تک ہر طرف
وہ بے ٹکٹ سفر کرتے تھے اور کبھی کوئی یہ بھی نہ پوچھتا تھا کہ تمہارے
منہ میں کے دانت ہیں ـــــ بعض اوقات شاہ صاحب عجیب عجیب
باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "تمہیں ایک سفید
سانپ لا کر دوں گا، اُس کے سر میں ایک مہرہ ہے۔ اس مہرہ کی
کی یہ تاثیر ہے کہ جو شخص اپنے بازو پہ باندھ لے وہ انسانوں کی
نظر سے پوشیدہ ہو جاتا۔ خود سب کو دیکھتا ہے دوسرے اس کو
نہیں دیکھ سکتے نہ چھو سکتے ہیں ـــ بند دروازوں میں وہ اس
طرح گذر سکتا ہے کہ گویا وہ کھلے ہیں" ـــــ میں نے کہا "شاہ
صاحب! کیا آپ نے کبھی طلسم ہوشربا کی کوئی جلد پڑھی ہے؟"
ـــــ میرے سوال پر شاہ صاحب نے کوئی توجہ نہ کر کے
شاہ صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھا" وہ سفید سانپ ایک
پہاڑ پر رہتا ہے، میرا بڑا دوست ہے، کہتا ہے جب میں مر جاؤں
تو یہ مہرہ میرے سر میں سے نکال لینا ـــــ اور جو میں ہی پہلے مر گیا ـــــ
میں نے پھر کہا "شاہ صاحب طلسم ہوشربا کے مصنف کے پاس
تو اس سے بھی بہتر چیزیں موجود تھیں۔ اُن میں سے ایک ہی مجھے

دلوا دیجیئے۔" کہنے لگے "یقین نہیں آتا ——— یقین نہیں آتا تو خاک ڈالو ———"

گرمیوں کا زمانہ تھا، میں طویل رخصت لے کر وطن آیا تھا۔ وہاں سے اپنے اہل وعیال کو لے کر پہاڑ پر چلا گیا ـــ آخر ستمبر کا موسم پہاڑ پر نہایت خوشگوار تھا۔ میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ میرے کمرے لب سڑک تھے ـــ ایک دن میں دوپہر کو کھانا کھا کر قیلولہ کر رہا تھا کہ نیچے سڑک پر کچھ شوروغل ہوا اور اس شوروغل میں شاہ صاحب اور چند لونڈے اور کچھ لاہرو چلے جا رہے ہیں شاہ صاحب حسب معمول شور مچاتے اور دوسرے لوگ ہنستے اور فقرے بازیاں کرتے ساتھ ساتھ ہیں۔ میں نے جو یہ دیکھا تو اپنے ملازم سے کہا کہ دوڑ اور شاہ صاحب کو بلا کر لا ——— غرض شاہ صاحب آ گئے ——— بڑبڑاتے، خفا ہوتے، شکوہ کرتے ——— "ارے میاں مار ڈالا تم نے ہم کو۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے مر گئے۔ اور پھر کم بخت لونڈوں نے ہم کو دق کیا ——— پولیس پکڑے لئے جاتی تھی۔ وہ تو ہیں خدا خدا کر کے چھوٹا ——— لاؤ دو روپے تو دو!"

——— غرض وہ کئی دن تک پہاڑ پر رہے، کھانا کھانے اور کبھی کبھی رات کو سونے کے لئے میرے پاس آجاتے تھے، پھر خدا جانے کہاں کہاں پھرتے تھے۔ ایک دن شام کو نہ جانے کہاں سے تھکے تھکائے

آئے۔ آکر لیٹ گئے۔ میں نے ایک کمبل اڑھا دیا ــــــ سردی اُس دن زیادہ تھی ــــــ کہنے لگے "آج میری دو باتیں سن لو۔ تم کبھی جھوٹ نہ بولنا، رشوت نہ لینا اور انصاف کرنا ــــــ اور ایک بات یہ کہ بہت سے دوست پیدا نہ کرنا ــــــ تنہائی اچھی ــــــ تم سے ہو سکے تو میرے لڑکے کو اپنے پاس بلا لینا اُس کی تنخواہ کم ہے اور وہ تکلیف میں رہتا ہے" ــــــ میں نے کہا "شاہ صاحب! تو گویا آپ وصیت کر رہے ہیں ــــــ ارادہ کیا ہے؟" کہنے لگے "نہیں بھائی کسی کو اپنا وقت تو معلوم نہیں ہوتا، معلوم نہیں کب بلاوا آجائے۔ میں کل یہاں سے جا بھی رہا ہوں۔ تم اپنی ملازمت پر چلے جاؤ گے، میرا آنا ہوا نہ ہوا۔ دو چار باتیں خیال میں آئیں وہ کہہ دیں۔ کل دوپہر کو ہم تمہارے ساتھ کھانا کھائیں گے اور بھائی ہمارے ساتھ آٹھ دس مہمان اور بھی ہونگے کھانے کا کافی انتظام کر لینا ــــــ" باتیں کرتے کرتے وہ سو گئے میں نے ایک اور کمبل اُن کے اوپر ڈال دیا ــــــ ہوٹل والے سے معلوم ہوا کہ وہ صبح تین بجے بارش اور سخت سردی کی حالت میں دروازہ کھول کر باہر نکل گئے ــــــ خدا جانے کدھر گئے ــــــ میں تو مایوس ہی ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ اکثر اسی طرح بھاگ جایا کرتے تھے اور پھر مہینوں اُن کا پتہ نہ چلتا تھا مگر اُسی دن دوپہر کو وہ آگئے لیکن اس وضع قطع کے ساتھ کہ کپڑے پھٹے ہوئے۔ ایک نہایت

پرانی انگریزی ٹوپی گھٹے ہوئے سر پر ــــ ہاتھ میں ایک درخت کی کٹی ہوئی شاخ مع پتوں کے اور دامن میں قسم قسم کے پتھر (ل) کے ٹکڑے ــــ سرخ، سفید، پیلے، نیلے وغیرہ ــــ ان کے پیچھے پیچھے دس بارہ سڑک کے لونڈے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے! وہ بے چارے ــــ یہ لونڈے ہوٹل کے اندر آتے ہوئے ڈرے مگر شاہ صاحب سب کو اندر پکڑ لائے۔ "بھائی آج ان کی دعوت کی ہے ہم نے" انہوں نے فرمایا۔ غرض کھانا آیا۔ لونڈوں نے خوب ڈٹ ڈٹ کے کھایا ــــ کھانے کے بعد شاہ صاحب نے کہا کہ ان سب کو ایک ایک آنہ پیسہ بھی دیدو۔ وہ بھی پیش کیا گیا۔ اس کے بعد شاہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے "ہم جا رہے ہیں۔" میں نے کہا "کب آیئے گا ــــ" کہا "دیکھو! شام کو نہیں تو صبح کو ــــ" یہ الفاظ جو شاہ صاحب کے آخری الفاظ تھے، مجھے خوب یاد ہیں ــــ شعر پڑھتے ہوئے، لونڈوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ رخصت ہو گئے ــــ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہیں۔

دوسرے دن ان کا پتہ نہ چلا ــــ مجھے کچھ تعجب بھی نہ ہوا، اس لئے کہ یہ تو اکثر ہوتا تھا کہ کہہ گئے ہیں شام کو

آؤں گا اور صورت دکھائی دو مہینے میں۔ لیکن اس دفعہ ان
کے واپس نہ آنے سے میرے دل میں ایک قسم کی بے چینی
تھی ـــــ دوسرا دن یوں ہی گزر گیا، تیسرے دن
میں چہل قدمی کر کے واپس آیا ہی تھا کہ پولیس کے ایک سب انسپکٹر
میرے پاس آئے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا کوئی پاگل آدمی
میرے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جواب اثبات میں پاکر انہوں
نے چند اور سوالات مجھ سے کئے اور اس کے بعد مجھ سے کہا
کہ "آپ ذرا تکلیف کیجئے میرے ساتھ آیئے!" میری سمجھ میں
نہ آیا کہ کیا معاملہ ہے، بہر حال پولیس افسر کے ساتھ ایک رکشا
میں بیٹھ کر میں روانہ ہوا ـــــ دو میل چلنے کے بعد
پہاڑ کی آبادی ختم ہو گئی۔ چوڑی سڑک کے بجائے اب ایک
تنگ اور پیچ در پیچ راستہ پر ہماری رکشا جاری رہی تھی۔ ہمالیہ
کی سرسبز وادیوں میں، فطرت انسانی۔ عقل و سائنس کی
تصنعات سے آزاد اس طرح کہ اس کے حسن کی بہاریں
کوہستان کے ہر ذرہ سے لپٹی ہوئی تھیں، میری نظروں میں
سمائی جاتی تھی ـــــ نظروں میں نہیں ـــــ روح میں!
میں نے اس پہاڑ کے بہت سے مناظر دیکھے تھے، اس حصہ
پر بھی بار بار آچکا تھا مگر وہ کیف تمام جو آج مجھ پر مسلط تھا کبھی
پہلے میسر نہ آیا تھا۔ حسن فطرت کے ایک قلزم ناپیدا کنار میں گویا

میں تیر رہا تھا ——— مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ یکایک سب انسپکٹر کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے ——— "نیچے وادی میں دیکھئے، یہ قریب ہی داہنی طرف کی چٹان پر ——— ایک لاش پڑی ہے ——— دیکھا آپ نے، وہ دیکھئے جہاں چنار کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے ——— ہمارے آدمی رسیوں کے ذریعے سے نیچے اتر رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا! شاہ صاحب کا جسم ایک شفاف چٹان پر چنار کے درختوں کے سایہ میں اس طرح پڑا تھا کہ اُن کا ایک داہنا ہاتھ سینہ پر رکھا ہوا تھا اور بایاں ہاتھ سر کے نیچے ——— گویا سو رہے ہیں!!

تھوڑی دیر میں لاش اوپر لائی گئی، کوئی زخم، کوئی چوٹ، کوئی خراش جسم پر نہ تھی، چہرے پر کسی تکلیف کے آثار بھی نہ تھے ——— ایک سکون کامل تھا ——— ابدی اور ازلی! البتہ ——— ان کے داہنے ہاتھ پر کہنی سے شانہ تک ایک سفید رنگ کا سانپ لپٹا ہوا تھا ——— وہ بھی مردہ ——— سانپ کے سر میں ایک شگاف تھا، ایک ایسا خلا جس میں سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز نکالی گئی ہے۔ وہ ایک خشک سوراخ تھا، زخم نہ تھا! ——— اس طرح ہم شاہ صاحب کو واپس لے کر آئے، لاش تھانہ میں لائی گئی پھر ڈاکٹر کے

معائنہ کے لئے لے جائی گئی۔ شبہ تھا کہ شاید موت سانپ کے کاٹنے سے واقع ہوئی ہو لیکن جسم پر نہ کوئی زخم تھا نہ خون میں کوئی زہر کا اثر تھا ـــــــ میری درخواست پر وہ لاوارث لاش میرے سپرد کردی گئی بعض مسلمانوں نے اعتراض بھی کیا مگر میں نے لاش کو نہ غسل دیا نہ کفن، بلکہ سانپ کے جسم کو بھی اُسی طرح اُن کے ہاتھ سے لپٹا رہنے دیا ـــ

مغرب سے آدھ گھنٹہ پہلے، پہاڑ کی ایک سرسبز وادی میں جہاں قدرت نے پھولوں کی میلوں لمبی چادریں بچھا رکھی تھیں ـــ شاہ صاحب کا جسد خاکی، سپرد خاک کر دیا گیا ـــــــ جب ہم میت کو قبر میں اتار رہے تو ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور چنار کے پتوں سے نکل کر ایک عجیب راگنی اس ساری وادی میں پھیل رہی تھی ـــــــ

اس طرح یہ مسافر اپنے وطن کو واپس گیا۔

مجھے اُن کے گذر جانے کے بعد (یہ نہ کہوں گا کہ مرنے کے بعد!) معلوم ہوا کہ میرے دل میں کس قدر اُن کی محبت جاگزیں تھی مجھے خود اس سے پہلے اپنے اس حال کی خبر نہ تھی ـــــــ لوگوں نے بہت پوچھا مگر میں سانپ کو اُن کے ساتھ دفن کرنے کی وجہ کو ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا ـــ

میرے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ مجھے پہلے ہی بتا چکے تھے کہ ایک سفید سانپ اُن کا دوست ہے —— رہا یہ امر کہ اس دوستی کا بھید کیا تھا —— سو وہ مجھے معلوم نہیں اور میری عقل سے بھی بالاتر ہے —— یہ داستان سچی ہے، اراکین مجلس اگر اس کو پسند کریں تو میرے لئے اُن کے "کلب" میں شرکت باعثِ مسرت ہوگی۔

رویائے صادقہ

"نقاش" صاحب کی یہ فیس داخلہ
منظور کی گئی۔

ذات کے وہ نوربافن تھے، محلہ والے سب اُن کو میر صاحب کہتے تھے۔ معمولی شُدبُد کے سوا پڑھے لکھے کچھ زیادہ نہ تھے۔ اُن کے گھر کی عورتیں اور بچے سب آبائی پیشہ کرتے تھے۔ وہ خود بھی فرصت کے اوقات میں لب سڑک سوت کا تانا بانا درست کرتے ہوئے اکثر دیکھے جاتے تھے۔ مگر عموماً وہ چھوٹے بچوں کو الف بے پڑھانا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے مکان کے دروازے کے آگے ایک چھوٹی سی کھپریل کے نیچے وہ بیٹھے ہوئے محلہ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو تشریح الحروف کا سبق دیا کرتے تھے وضع قطع مولویانہ تھی۔ سر پر ہمیشہ ایک چھوٹی سی پگیا باندھے رہتے تھے۔ پاجامہ کے بجائے اکثر نیلے رنگ کی لنگی، کرتا گاڑھے کا وہ بھی اکثر میلا ـــــ یہ اُن کی وضع قطع تھی۔ حقہ بہت پیتے تھے اور عموماً مکتب کے بچے میر صاحب کی چلمیں بھرا کرتے تھے ـــــ یہ چلمیں بھرنا ان کی تعلیم و تربیت کا گویا ایک ضروری جزو تھا! معلوم نہیں کیوں لوگ ان کو بجائے ملاجی کے میر صاحب کہا کرتے تھے۔ خدا بخش اُن کا نام تھا مگر بہت کم لوگ یہ جانتے تھے حتیٰ کہ اُن کے گھر کے لوگوں میں شاید ہی ایک دو کو اُن کا اصلی نام معلوم ہو۔

میر صاحب کی ایک عجیب عادت تھی۔ کبھی کبھی وہ بالکل خاموش ہو جاتے تھے ــــ اس قدر کہ دو دو دن ایک حرف اُن کی زبان سے ادا نہ ہوتا تھا، ایسی حالت میں وہ عموماً مسجد میں جا بیٹھتے تھے یا چادر اوڑھ کر لیٹ رہتے تھے اور نانا بانا اور مکتب حتیٰ کہ حقہ بھی متروک موقوف ہو جاتا تھا۔ ان کے مکان کے سامنے چند پہاڑیاں تھیں کبھی کبھی ان پر جا بیٹھتے تھے۔

محلّہ کے شرفا کی صحبت میں وہ اکثر بیٹھا کرتے تھے اور اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اکثر یاروں یاروں کا آلۂ تفریح بن جاتے تھے اُنکے متعلق دل لگی کا مستقل مضمون تھا کہ وہ اکثر خوابیں دیکھا کرتے تھے اور اُن کو بڑی سادگی سے بیان کیا کرتے تھے۔ احباب ان کی باتوں کا خوب مذاق اڑاتے تھے اور عجب عجب بے تکی تعبیریں تجویز کی جایا کرتی تھیں۔ مثلاً میر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ ایک شیر ایک ہرن پر حملہ کر رہا ہے ــــ یاروں نے فوراً تعبیر پیش کی کہ شیر درحقیقت شیطان ہے اور ہرن میر صاحب ہیں! یا میر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ درخت سے ایک پکا ہوا آم گرا ہے، یاروں نے فوراً تعبیر دی کہ میر صاحب کے گھر میں یقیناً بچہ ہونے والا ہے ــــ غرض تعبیروں کا یہ سلسلہ اکثر بہت پر لطف رہا کرتا تھا۔ مگر میر صاحب بے چارے کبھی یہ محسوس نہ کر سکے کہ ان سے مذاق کیا جا رہا ہے ــــ یہ کوئی چالیس برس کی بات ہے میری

نوجوانی کا زمانہ تھا، ان صحبتوں میں جہاں میر صاحب سامانِ تفریح بنائے جاتے تھے میں بھی اکثر موجود ہوتا تھا۔ اب میر صاحب کو انتقال کئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے لیکن اس تفریح اور مذاق میں —— اب جو غور کرتا ہوں تو بہت سے عجیب پہلو نظر آتے ہیں۔ یا تو پہلے اپنی جوانی کی ترنگ میں کبھی ان باتوں کی طرف خیال نہ گیا، یا اب بڑھاپے کے آغاز نے توہمات پیدا کر دیئے ہیں —— غرض کسی نہ کسی وجہ سے میر صاحب مرحوم کی بہت سی باتیں بالکل نئے رنگ میں نظر آ رہی ہیں۔

مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ خدا کے فضل سے معاش کی فکر نہ تھی اس لئے اکثر لمبے لمبے سفر کرتا رہتا تھا، مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں بمبئی جانے کے لئے سامانِ سفر تیار کر رہا تھا کہ میر صاحب آ گئے۔ پہلے اس کے میں سفر کا ارادہ ظاہر کروں انہوں نے بیٹھتے ہی حقہ اپنی طرف بڑھایا اور کہنے لگے۔

"میاں رات ہم نے ایک خواب دیکھا!"

"ہاں! میر صاحب! کیا دیکھا آپ نے؟"

"ہم نے دیکھا کہ ایک جنگل میں صبح کا وقت ہے، بارش ہے اور ایک دریا ہے —— بہت بڑا ——"

"دریا ہے؟ بہت بڑا ہے؟ تو پھر کیا ہوا میر صاحب؟"

"بس میاں میں نے دیکھا کہ اس دریا میں تم ایک کشتی پر سوار

چلے جا رہے ہو اور کشتی جھکولے کھا رہی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ڈوبی، اب ڈوبی! میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا ——"

"گھبرا گئے آپ میر صاحب؟ نا میر صاحب؟ جو کشتی جھکولے نہ کھائے وہ کشتی ہی کیا۔"

"میاں! میں تو گھبرا گیا، جلدی سے میں نے اپنی چادر دریا کے کنارے پر بچھا دی اور سجدہ میں گر گیا اور تمہارے لیئے دعا کرنے لگا۔"

دعا تو مقبول ہوئی، میر صاحب! دیکھیئے میں بخیریت گھر آ گیا!"

اسی دن شام کو میں روانہ ہو گیا —— جاڑوں کا زمانہ تھا اور رات کو بارش ہونے لگی۔ بمبئی ایکسپریس پوری رفتار سے جا رہا تھا۔ میں کمبلوں میں لپٹا ہوا کچھ سو رہا تھا کچھ جاگ رہا تھا، مگر جاگ کم رہا تھا سو زیادہ رہا تھا۔ یکایک ایک سخت جھٹکا لگا اور گاڑی رک گئی۔ میں بستر سے گرتے گرتے بچا۔ گھبرا کر کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ بارش ہو رہی ہے اور انجن کے پاس کچھ لوگ لالٹینیں لیئے کھڑے ہیں۔ —— جب گاڑی کو ٹھہرے ہوئے بہت دیر ہو گئی تو میں گاڑی سے اترا اور بھی بہت سے مسافر دریافت حال کے لیئے اتر چکے تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ دفعتاً انجن خراب ہو گیا۔ ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک بڑے دریا کا پل تھا۔ انجن کا ایک ملازم پل کے چوکیدار کو بلانے کے لیئے اس طرف گیا تو اس نے دیکھا کہ چوکیدار غائب ہے، دریا چڑھا ہوا ہے اور پل ٹوٹا پڑا ہے۔ زندگی کے فرشتے نے عین وقت پر انجن کی مشین خراب کر دی۔ ورنہ ایک ہی فرلانگ کے

فاصلے پر موت کا فرشتہ منہ کھولے بیٹھا تھا۔۔۔ جوانی میں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوا کرتی کہ موت اور زندگی کے درمیان فاصلہ کس قدر کم ہے، جوان آدمی سمجھتا ہے کہ وہ زندہ اس لئے ہے کہ زندہ رہنا اس کا حق ہے، موت سے اس کو کچھ واسطہ نہیں! اس قسم کے واقعات کا جو اثر بڑھاپے میں طبیعت پر ہوتا جوانی میں نہیں ہوتا اس وقت تو صرف ایک "اونہہ" کہہ کر بڑی سے بڑی ٹال دی جاتی ہے۔۔۔ قصہ مختصر ہماری ٹرین ایک بڑے اسٹیشن واپس لائی گئی صبح کو دریا کے دوسرے پار اُدھر سے ایک ٹرین لائی گئی اور ادھر سے مسافر کشتیوں پر سوار کر کے اس پار پہنچائے گئے۔۔۔ صبح کا وقت تھا۔۔۔ ہوا بہت تیز تھی ہماری کشتی ہچکولے لے رہی تھی۔۔۔ بہت سے مسافر تو اس قدر خوفزدہ تھے کہ کشتیوں پر سوار ہو کر پھر اتر گئے، میری کشتی پر صرف ایک انگریز اور اس کی بیوی میرے ہمسفر تھے۔۔۔ یہ بھی ایک لطیفہ ہے بیان کر دینے کے قابل۔۔۔ پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا اور آندھی کی وجہ سے کشتی کی حالت یقیناً خطرناک تھی میں بھی پریشان تھا اور فرنگی صاحب کی بیوی تو بیچاری اپنے بکس اور بستر پر خوف اوندھی پڑی ہوئی تھی مگر میرا ہمسفر وہ انگریز بہت مطمئن تھا اور اس ہوا میں بار بار اپنا سگریٹ سلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بے پرواہی کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔ "آپ بہت مطمئن ہیں" وہ کہنے لگا۔ "خیر مطمئن ہونے سے کیا فائدہ ہے۔ اگر ڈوبنا ہی ہے تو میں ایک سگریٹ اور کیوں نہ پی لوں!" بے ثباتِ زندگی کے متعلق یہی نقطۂ

نظر ہے جو زندگی کی ضمانت ہے ـــــ زندگی کے پھل کو اتنا نچوڑو کہ اس کے رس کا آخری قطرہ بھی باقی نہ رہ جائے ـــــ مرتے دم تک زندگی کے مزے اٹھائے جاؤ! روتے ہوئے گئے تو کیا گئے! موت کے اندیشے میں گھلتے رہنے سے موت ٹل تو نہیں جاتی! پھر اندیشہ کیوں ہے" ـــــ اس انگریز کے اطمینانِ قلب کو میں کبھی نہ بھول سکا ـــــ ہم بخیر و عافیت دوسرے کنارے پر پہنچ کر پھر ٹرین میں سوار ہو گئے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد آتا ہے ـــــ والد مرحوم ہردوئی کے ضلع میں ایک بزرگ کے مزار پر اکثر جایا کرتے تھے خصوصاً عرس کے زمانہ میں۔ غالباً میرے اندر ایمان اور عقیدہ پیدا کرنے کے لئے اکثر مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ قوالی اور میلہ کی چہل پہل کے سوا اور کوئی ترغیب میرے لئے ایسے موقعوں پر نہ ہوتی تھی! مقدس مزار کے "عرفانیات" سے اس وقت بھی اتنا ہی بے بہرہ تھا جتنا کہ اب ہوں بہر حال والد مرحوم کے ساتھ خوش و ناخوش جانا ہی پڑتا تھا۔ پیر صاحب ایک دن رات کو آئے، حقہ کے دو چار کش لے کر وہ ذرا کھانسے کہنے لگے

"میاں رات ایک عجیب خواب دیکھا ہم نے۔"

"پھر آپ نے کوئی خواب دیکھ ہی ڈالا پیر صاحب۔" میں نے کہا۔

"ہاں! میاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہو گی۔"

"سنائیے تو ذرا! ہم بھی اپنی عقل پر کچھ زور ڈالیں گے، شاید تعبیر

ہاتھ آئے۔"

کہنے لگے "بھئی یہ خواب دیکھا ہم نے کہ ایک جنگل بیابان ہے اس جنگل میں ایک پختہ کنواں ہے اور اس کنویں کے پاس ہم کھڑے ہیں اور ہمارے ہاتھ میں دو بیلوں کی نکیل ہے ــــ گویا ہم ان کو پکڑے کھڑے ہیں ــــ بس پھر آنکھ کھل گئی ــــ"

میں نے کہا "واہ میر صاحب! بہت بے موقع آنکھ کھلی آپ کی! اگر بیل نے آپ کے پیٹ میں سینگ مار دیا ہوتا اور اس صدمہ سے آپکی آنکھ کھل جاتی تو کوئی بات بھی ہوتی ــــ یہ کیا کہ بلا وجہ آپ کی آنکھ کھل گئی ــــ معلوم نہیں آپ کو بیل کہاں لے جاتے ــــ یا آپ بیلوں کو کسی طرف لے جاتے، پھر اس کے بعد خبر نہیں کون سا واقعہ پیش آتا ــــ یہ تو کچھ نہ ہوا کہ آپ کی آنکھ قبل از وقت کھل گئی!"

"ہاں میاں!" وہ کہنے لگے "بس ہم نے تو اتنا ہی خواب دیکھا۔"

"تو پھر آپ تعبیر چاہتے ہیں اس خواب کی؟" میں نے سوال کیا ــــ "تعبیر یہ ہے کہ یا تو وہ دو بیل فرشتے تھے جو اس کنویں کے اندر آپ کو لے جانا چاہتے تھے ممکن ہے جنت کا راستہ اس کنویں کے اندر ہو، یا ممکن ہے وہاں کوئی خزانہ رکھا ہو ــــ اور اگر وہ فرشتے نہ تھے ــــ

ــــ منکر نکیر بھی نہ بنتے تو یقیناً آپ کے کسی دشمن کی ارواح خبیث
خیریت ہوئی کہ انہوں نے سینگ نہیں مارے ــــ اور تو کچھ
سمجھ میں نہیں آتا میر صاحب! ــــ

میر صاحب بے چارے "شئے لطیف" سے اس قدر محروم
تھے کہ گفتگو کے اتار چڑھاؤ کو کبھی نہ سمجھ سکے ــــ "نہیں
میاں! یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی" انہوں نے کہا۔

"تو پھر آپ ذرا اپنا فالنامہ بھی دیکھئے ــــ"

میر صاحب کے پاس مطبع نول کشور کا چھپا ہوا ایک بوسیدہ
فالنامہ بھی تھا جس سے وہ اکثر اپنی خواب کے الجھنوں کو سلجھانے
میں مدد لیا کرتے تھے ــــ

غرض کہ اس دن کی یہ بات آگئی ہوئی۔ تین چار دن بعد میں
والد کے ساتھ عرس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہوا ــــ

روانہ کیا خاک ہوا! "ولے برندش" کے ذیلی جانا پڑا ــــ ریل
کے اسٹیشن سے ۱۵ میل کے فاصلہ پر ہماری منزل تھی۔ عموماً اسٹیشن
پر گھوڑے کا ایک تانگہ مل جایا کرتا تھا لیکن اس دفعہ نہ معلوم کیوں کوئی
سواری موجود نہ تھی۔ مجبوراً قریب کے گاؤں سے ایک رتھ کرایہ پر لیا گیا
دوپہر کو ہم روانہ ہوئے اور امید تھی کہ شام ہوتے ہوتے منزل پر پہنچ
جائیں گے۔ کوئی چار بجے ہوں گے، ہم آدھے راستے میں تھے اور
ایک کنوئیں پر پانی پینے کے لئے ٹھہر گئے تھے کہ یکایک ایک شدید آندھی

آئی ـــــ ایسی شدید کہ میں نے اس سے زیادہ شدید آندھی اپنی عمر میں نہیں دیکھی۔ تمام جہان تیرہ و تار ہو گیا، ہاتھ سوجھائی نہ دے اور ہوا کی شدت کا یہ حال کہ ہم دونوں رتھ میں نہ بیٹھ سکے، نیچے اتر کر رتھ کے پہیے پکڑ کر بیٹھ گئے لیکن ہوا اس بھاری رتھ کو زمین سے دو دو ہاتھ اٹھا رہی تھی۔ ایک جھونکا تو ایسا آیا کہ رتھ اور اُس کے ساتھ ہم اور رتھ بان سب ہی لوٹتے پوٹتے کہاں سے کہاں پہنچے ـــــ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس آج اس جنگل میں خاتمہ ہے ـــــ خدا خدا کر کے تاریکی کم ہوئی اور ہوا کی شدت بھی ـــــ اب جو دیکھا تو والد ایک درخت کی جڑ میں پڑے ہیں۔ میں دوسرے درخت کی۔ اور رتھ بان رتھ کے نیچے دبا پڑا ہے۔ اور رتھ کنوئیں سے آدھے فرلانگ کے فاصلہ پر اوندھا پڑا ہے۔ ہم تینوں آدمی زخمی ہوئے تھے اور اب کوئی امید نہ تھی کہ منزل پر پہونچ سکیں۔ خیال یہ تھا کہ اس طوفان میں جب رتھ آدھے فرلانگ تک اڑ گیا تو اس کے بیل تو خدا جانے جنگل میں کہاں کے کہاں پہنچے ہوں گے ـــــ مگر کنوئیں کی طرف جو آئے تو دیکھا کہ دونوں بیل بدستور اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں رتھ میں جتے ہوئے کھڑے تھے۔ حیرت ہوئی کہ آندھی کے اس ہنگامہ میں کس طرح وہ اپنی جگہ کھڑے رہے ـــــ بہر حال زخمی اور خستہ، اُس رتھ میں رات کو منزل پر پہنچ گئے ـــــ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت! ـــــ ذو کنوال عرصہ

تک مجھے یاد رہا۔ عرصہ تک میں کبھی کبھی میر صاحب سے کہا کرتا تھا کہ میر صاحب اگر یہ وہی کنواں ہے جو آپ نے خواب میں دیکھا تھا تو ضرور اُس میں یا تو جنّات رہتے ہیں، یا جنّت کی طرف چلنے کا کوئی راستہ ہے یا کوئی خزانہ موجود ہے! ــــــ میر صاحب حقہ کے کش لے کر اپنا کوئی دوسرا خواب سُنانا شروع کر دیتے۔

میر صاحب کو خود بھی یہ خیال تھا کہ اُن کا خواب اکثر سچا ہوتا ہے اور اس کے ثبوت میں وہ بہت سے واقعات پیش کیا کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ جب میں چاند گرہن یا ستارہ ٹوٹتے ہوئے خواب میں دیکھتا ہوں تو کوئی بڑا مشہور آدمی ضرور مرتا ہے چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو شاہ ایڈورڈ کے انتقال کی خبر آئی۔ پھر ایک دفعہ یہی منظر انہوں نے خواب میں دیکھا تو امیر حبیب اللہ خاں قتل ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ اگست ۱۹۱۴ء کے پہلے ہفتہ میں انہوں نے دیکھا تھا کہ ایک بہت بڑا دریا ہے اور اس کے دوسرے کنارے پر جنگل تا حدِّ نظر آگ لگی ہوئی ہے ــــ چنانچہ اُن کی رائے میں یہ اشارہ تھا اُس جنگِ عظیم کی طرف جو یورپ میں دو چار ہی دن بعد شروع ہوگئی ــــــ غرضکہ میر صاحب کے پاس اس قسم کے واقعات کی ایک طویل فہرست تھی۔ ہم تو قطع کلام کر کے کبھی ان کو پوری فہرست سنانے کا موقع نہیں دیا کرتے تھے۔ مگر تاہم

اُن کو اپنے خوابوں کی ایسی تعبیروں پر بہت وثوق تھا۔ غرض کہ ہماری دل لگی کا یہ سلسلہ ہمیشہ تازہ بتازہ جاری رہتا تھا۔ اُسی زمانہ روس سے لینن کے مرنے کی خبر آئی۔ ہم نے میر صاحب سے کہا "واہ میر صاحب ہار گئے۔ اس دفعہ تو آپ کو پتہ ہی نہ چلا اور لینن مر گیا۔ دے گیا آپ کو غچّا ——— بھلا اتنا بڑا آدمی مرے اور آپ کو خبر بھی نہ ہو، آپ کے مؤکّل بہت غافل رہنے لگے ہیں ———" میر صاحب فرماتے: "نہیں تو میاں خواب ہمیشہ تو نظر آتے ہی نہیں"۔ ہم کہتے: "نہیں میر صاحب! یہ بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ دُور کے خواب آپ کو نظر ہی نہیں آتے۔ افغانستان اور انگلستان تک کی خبر تو آپ لاتے ہیں مگر روس کا ملک بہت دُور ہے ——— گولی کی زد سے باہر! بس اب رہنے دیجئے، معلوم ہوئی آپ کی نارسائی"۔

ایک دن صبح ہی صبح میر صاحب آئے ——— کچھ گھبرائے ہوئے سے ——— فالنامہ اُن کے ہاتھ میں! آتے ہی کہنے لگے۔ "میاں رات ایک خواب دیکھا کہ میں ایک دریا کے کنارے بیٹھا ہوں۔ چودھویں رات کی چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ میں اس قدر خوش ہوں کہ بار بار میرا جی چاہتا ہے کہ اس دریا کے شفاف پانی میں کود پڑوں۔ یکایک ہوا چلنی شروع ہوئی اور ایسا غلیظ ابر آیا کہ ہر طرف سخت تاریکی پیدا ہو گئی۔ چاند کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا اور دریا کا

چمکتا ہوا پانی بھی نظر نہ آتا تھا مگر پانی سے ایک عجیب قسم کی آواز پیدا ہونے لگی۔ پھر یکا یک بادل گرجا اور بجلی کڑک کر پانی پر گری اور اسی کے اندر غائب ہو گئی ——— "میر صاحب نے اپنے کرتہ کے دامن سے پیشانی کا پسینہ پونچھا ——— "میرے دل پر خوف طاری ہے اللہ رحم کرے میاں! میں نے کہا "واہ میر صاحب! آپ تو گھبرا گئے رات آپ نے کھایا کیا تھا" وہ بےچارے میرے اشارہ کو کچھ نہ سمجھے فوراً کہنے لگے "اُڑد کی دال، روٹی، اور دہی" ——— میں نے کہا "بس تو میر صاحب معلوم ہو گیا، رات آپ کے معدہ میں رطوبات بہت زیادہ پیدا ہوئیں، مرطوب گیس نے دماغ کو گھیر لیا ——— اور ایسا تو اکثر ہوتا ہے آپ پوچھ لیجئے کسی طبیب سے ——— میر صاحب بیچارے کے دل کو تسکین نہ ہوئی — قضا نے قصّہ مختصر کر دیا، دوسرے دن اُن کا ایک بچہ طاعون میں مبتلا ہوا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر بیوی، پھر ایک اور عورت غرض تین دن میں سارا گھر صاف ہو گیا۔ میر صاحب اکیلے رہ گئے ——— ہم لوگ اس حالت میں جو کچھ ہمدردی اور دلداری کر سکتے تھے وہ کی۔ میر صاحب کا زخم بہت گہرا تھا۔ اس دن سے وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ نہ بات کرتے تھے نہ کسی کی بات کا جواب دیتے تھے۔ صبح کو گھر سے نکل جاتے تھے اور پہاڑیوں پر پھرا کرتے تھے۔ شام کو عشا کے وقت مسجد میں آ کر لیٹ جاتے تھے! آخری جنازہ اٹھانے کے بعد وہ پھر کبھی گھر کے اندر نہیں گئے ——— اُن پہاڑیوں میں شہر کے

کے محکمہ آب رسانی کا ایک ذخیرۂ آب تھا، اکثر وہ اُس کے قریب بیٹھے ہوئے پائے گئے ـــ ایک دن اُس کے حوض میں اُن کی لاش تیرتی ہوئی ملی ـ خالنامہ کے اوراق بھی اُن کی لاش کے قریب تیر رہے تھے!

ـــــــ رویائے صادقہ اور سویدا ہضم یا احتباس یا دماغ میں حدِ فاصل کیا ہے ـــ کچھ ہے بھی ـــ مجھے خبر نہیں! انجمن کے دوسرے اراکین اس تاریکی میں روشنی کی کوئی شعاعیں پائیں تو مجھے ضرور بتائیں ـــــ!!

(از جہاں گرد)

اطلاع ملی ہے کہ چند روز ہوئے راقم الحروف پاگل خانہ میں داخل کر دیئے گئے۔ اس لئے اب اس بیان پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ داخل دفتر کیا جائے

عجیب ہے میری داستان۔

میری داستان کا یہ ایک ورق ______

کوئی یقین کرے یا نہ کرے! تو واہ واہ نہ کرے، تو واہ واہ! جو کچھ لکھنا تھا لکھ دیا میں نے! اس کے بعد جو کچھ ہے! پڑھنے والوں کی عقل و فہم ہے اور اس پر مجھے بھروسا نہیں ____ ہاں صاحب! تو اب سنئیے!

۱۱ برس کی عمر سے میں نے سیاحی شروع کی۔ پاؤں میں کچھ ایسا چکر ہے کہ کبھی کسی ایک جگہ برس چھ مہینے جم کر نہیں رہتا۔ دنیا کے کونے کونے اور گوشہ گوشہ کی خاک چھان ڈالی۔ آج عراق میں، تو کل ایران میں، پرسوں روس میں تو اگلے روز نہر سویز پر! نہر سویز سے فلایخ ماری تو پناما پر! پناما سے چلا تو ٹوکیو میں! غرض کہ میری ٹانگیں اگر کسی گھسنے والے مادّہ کی بنی ہوتیں تو آج تک آدھے سے زیادہ گھس چکا ہوتا۔ بارہا ارادے کئے کہ بس اب جہاں گردی ختم کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ رہوں لیکن طبیعت کمبخت ناصبور ہے ____ جہاں چند روز دم لیا اور سیاحوں کے آوارہ گرد شیطان نے انگلی دکھائی ____ بھاگا ____ منہ اٹھائے، آنکھیں بند کیئے۔

ایک دفعہ شیراز میں "آب رکنا باد" کے ساحل پر چار مہینے
بیٹھا رہا۔ طے کر لیا کہ یہیں مریں گے ـــــ پھر جو ایک دن
ہڑک اٹھی تو سمرقند میں آ کر دم لیا۔

جس سفر کا حال بیان کرتا ہوں، یہ گویا میرا آخری سفر سمجھیے
ـــــ میری عادت ہے کہ اپنے ہر سفر کا ایک روزنامچہ ضرور
لکھتا رہتا ہوں کہیں کہیں سے اس کے دو چار اقتباسات اراکین
انجمن کے لئے شاید دلچسپی کا باعث ہوں۔ اور اگر نہ ہوں تو یہ
بدنصیبی اراکین انجمن کی۔

مئی کا مہینہ تھا جب میں کابل سے ہرات آیا۔ ہرات سے
مرو جانے کا قصد تھا اور پھر مرو سے بخارا، سمرقند، تاشقند ہوتے
ہوئے ماسکو۔ یوں تو کئی دفعہ وسط ایشیا کے پھیرے کر چکا تھا مگر کبھی
وہاں زیادہ ٹھہرنے اور وہاں کے کوہ و صحرا میں خاک اڑانے کا کافی
موقع نہ ملا تھا۔ اب کی دفعہ ارادہ تھا کہ چند روز چنگیز، تیمور اور بابر
کے وطن میں بے فکری اور اطمینان کے ساتھ گزاروں ـــــ
مگر کیا معلوم تھا ـــــ معلوم تو تھا مگر بھول گیا تھا کہ ارادے
خود بخود بدل جایا کرتے ہیں۔ منہ مشرق کی طرف ہوتا ہے اور انسان
چلتا ہے مغرب کی طرف! اس کارخانہ میں جس کو دنیا کہتے ہیں، ہم
مع اپنے ارادوں کے فرعون کے غلاموں سے بھی بدتر ہیں ـــــ

—— رسیاں ہمارے گلوں میں ہیں اور کوئی ہے پیچھے —— چابک بدست! جس کے تازیانہ کی ضربیں سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی کب دیتی ہیں —— یہ غلام کیا جانیں کہ کدھر سے آئے اور کدھر جانا ہے!—— خیر!—— تو مئی کا مہینہ تھا جب میں ہرات سے مرو کی جانب روانہ ہوا، آگے کا حال میرا روزنامچہ بتائے گا:-

۲۱ مئی۔

کرخ نامی قصبہ میرے سامنے ہے، پہاڑی سڑک پر، سورج کی تمازت اور صحرائی ہوا کے گرم جھونکے! میرے ہم سفر دو تاتاری اور ایک افغان ہیں۔ تاتاریوں میں سے ایک سفید ریش بڑھا یعقوب نامی ہے جو قصبہ میمنہ میں ایک تکیہ کا متولی ہے —— باتونی اتنا کہ الٰہی توبہ! کان کھا گیا! ایسے ایسے قصے سناتا ہے کہ گویا اس ملک میں انسانوں سے جنات کی تعداد زیادہ ہے۔ ہر منزل پر وہ جنوں اور پریوں کا ایک نیا قصہ سنا دیتا ہے —— ہمارے ملک میں بھی کوہ قاف کی پریاں اور دیو بہت مشہور ہیں۔ میں نے بھی کوہ قاف کے پہاڑوں پر بہت ٹھوکریں کھائی ہیں مگر آج تک ایک کانی کھتری پری بھی نظر نہ آئی! لیکن ہمارے ہم سفر یعقوب کو ہر روز ان ارواح سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور وہ ان پریوں اور دیوؤں کے ساتھ اپنی دوستی اور دشمنی کے عجیب عجیب قصے سناتے ہیں۔

میرا گھوڑا جنگل کے کانٹوں میں اُلجھ کر گِرتا ہے، مگر تاتاریوں کے اونٹ بے تکان چلے جا رہے ہیں۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ اونٹ اُن کانٹوں کو کیونکر بے تکلف کھا جاتے ہیں جن کی نوکیں سوئیوں کی طرح زخمی کرتی ہیں۔ ہم ان کانٹوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے اور اونٹ کے منہ میں وہ بالائی کی طرح گھل جاتے ہیں۔ راستے میں کہیں کہیں ترکمانوں کے خیمے اور ڈیرے بھی ملتے ہیں۔ میں اُن کی زبان خوب بول لیتا ہوں اس لئے بے تکلف دس پانچ منٹ کسی خیمہ کے آگے ٹھہر کر دم لیتا ہوں۔ دو گھونٹ پانی پیتا ہوں اور پھر چل دیتا ہوں۔ شام تک سوائے لق و دق میدان، کانٹے دار جھاڑیوں اور متفرق اونچی نیچی پہاڑوں کے کوئی منظر ایسا نہ تھا جو آنکھوں کے لئے تسکین دہ ہوتا ـــــ خدا خدا کر کے انسانوں کی آبادی نظر آئی ہم رات کو آٹھ بجے کے قریب کرکی پہنچے۔

۲۷ رمئی۔

دریائے جیحون دو قلعوں کے درمیان بہتا ہے دائیں کنارہ پر ایک چھوٹا سا پرانا قلعہ ہے اور بائیں کنارہ پر ایک بڑے قلعہ کے دامن میں یہ بستی ہے۔ آج کل دریا چڑھا ہوا ہے۔ بستی کی سرائے میں اس کے بہنے کی آواز اس طرح آ رہی ہے کہ گویا کوئی آلہ ہوائی ہوا میں اڑتا ہوا جاتا ہے ترکمانوں کو لَے اور قرأت کیساتھ منظوم کہانیاں سننے کا بہت شوق ہے۔ رات کو سرائے کے صحن میں

دس بیس آدمی آکر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی کہانیاں گا گا کر ایک دوسرے کو سناتے ہیں
رات میں بھی کچھ دیر اُن کی صحبت میں شامل رہا۔ صحرائی لوگ ہیں، سادہ لوح، سادہ
دل، غضب ناک، زود رنج توی اور بے خوف ــــ ایسے جو تیمور اور بابر کی اولاد
ہونیکا دعویٰ کر سکتے ہیں! ــــ بدویت اُن کے رگ و ریشہ میں ہے۔ اُن
کی کہانیاں سب کی سب جنات پریوں اور ارواحِ خبیثہ کے ذکر سے پُر
ہوتی ہیں۔ حضرت سلیمان ع کے قصے، ہاروت و ماروت کی داستان کوہ قاف
کی پریوں اور اُن کے بادشاہ کے حالات ــــ بس یہی اُن لوگوں کی
کہانیاں ہیں ــــ دُنیا سے بے خبر اور بے پروا!! ــــ کیا اب
بھی کبھی وسط ایشیا کے کسی صحرا نشین کا مرکب البرز یا ہمالیہ کی چوٹیوں کو
ٹھکرا سکے گا؟

ــــ خدا جانے!!

۲۳ مئی

صبح کرکی سے روانہ ہو کر سبز کوفرشی پہنچ گئے۔ دن بھر کا سفر
بہت غیر دلچسپ تھا، راستہ میں ایک قافلہ ہرات کی طرف جاتا ہوا ملا۔ زیادہ
ترکمان تھے، اونٹوں پر اون لدی ہوئی تھی ــــ کس طرح اس دُنیا
کے مسافر راستہ میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور گذر جاتے ہیں! ایک
لمحہ کی ملاقات ــــ زندگی کے لق و دق صحرا میں ــــ کس قدر خوش
آیند ہوتی ہے، پھر اُن میں سے ہر ایک اپنے اپنے راستہ چلا جاتا ہے
ــــ تھوڑی دیر بعد صحرا میں اُن کا نشان بھی باقی نہیں رہتا ــــ

تھوڑی سی گرد اُڑتی ہوئی رہ جاتی ہے، —— چند ساعت کے بعد وہ گرد بھی باقی نہیں رہتی، وہی صحرا ہوتا ہے، وہی پہاڑیاں وہی سکونِ مطلق!!! ملنے کی خوشی اور جُدائی کا رنج بھی باقی نہیں رہتا!!۔

اس قدیم قصبہ کا نام کسی زمانہ میں نخشب تھا۔ فارسی اور تورانی ادبیات میں اُس کا قدیم نام آج تک بھی مشہور رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک جادوگر رہتا تھا جس نے ایک چاند بنایا تھا جو ہر شب کو ایک کنوئیں سے نکلا کرتا تھا اور صبح کو پھر کنوئیں میں غروب ہو جاتا تھا۔ فارسی زبان میں "ماہ نخشب اندر چاہ نخشب" آج تک زبان زد ہے۔ میں بھی اُس کنوئیں کو دیکھنے گیا تھا۔ بہت شکستہ اور بوسیدہ حالت میں ہے۔ خانہ بدوش ازبکوں کے خیمے اُس کے قریب ہی لگے ہوئے تھے، اُن کی بھیڑوں کے گلّے سامنے جھاڑیوں کے پاس چر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جادوگر کا چاند ایک دن اس کنوئیں میں ایسا غروب ہوا کہ پھر نہ نکلا۔ جادوگر بھی دیوانہ ہو کر اسی کنوئیں میں کود گیا —— رات کو ازبکوں نے اس کنوئیں کے متعلق عجیب عجیب قصّے سُنائے۔

۲۴ مئی

سمرقند قریب ہے، ایک دن کی مسافت سے زیادہ نہیں یا شاید کچھ زیادہ ہو اس لئے کہ موسم گرم ہے اور راستہ بہت ناہموار ہے۔ بہر حال اگر صبح روانہ ہو جاتا تو شام تک پہنچ ہی جاتا۔ لیکن طبیعت بہت کسلمند ہے، سب ساتھی روانہ ہو گئے اور میں نخشب ہی میں پڑا رہ گیا۔

بیمار تو نہیں ہوں، چاہتا تو چل دیتا، لیکن معلوم نہیں کیوں ارادہ کمزور ہے!! ــــــ دن بھر سرائے میں پڑا رہا شام کو سرائے کے قریب ایک مسجد ہے اس کے صحن میں جا بیٹھا، پھر وہاں سے اٹھ کر جادوگر والے کنوئیں کے چبوترہ پر بیٹھ کر روزنامچہ لکھنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، اذبکوں کے خیمے اکھڑ چکے۔ وہ اپنے گلوں کو لے کر کسی طرف چل دیئے۔ ہر طرف سناٹا ہے ــــــ طبیعت تھکی ہوئی ہے، نیند سی آرہی ہے ــــــ ذرا لیٹ رہوں ــــ غنودگی پُر لطف ہے ــــــ غنودگی کیا اچھا خاصہ نشہ معلوم ہوتا ہے ــــــ آنکھیں جھکی جاتی ہیں ــــ

ــــــ کنوئیں کے اندر ایک قسم کی روشنی نظر آتی ہے۔ ــــــ

ــــــ کہیں جادوگر کا چاند تو نہیں ہے! ــــــ

ــــــ "ماہِ نخشب اندر چاہ نخشب" ــــــ

ماہ نخشب اندر ــــــ ماہِ نخشب ــــــ ماہ اندر

چاہ ــــــ ماہِ نخشب ــــــ ماہِ نخشب ــــ چاہ

ــــــ ماہ ــــــ

~~~

یکایک میری آنکھ کھلی۔ گویا بہت بلندی سے نیچے گرا ہوں ــــ ــــــ گرتا چلا جاتا ہوں ــــــ ایک اندھیری سرنگ ہے ــــــ اس قدر اندھیری ــــــ اس قدر اندھیری ــــ اس قدر کہ بس! ماہ نخشب کی تلاش ہے مجھے ــــــ
~~~

سامنے روشنی کا ایک نقطہ نظر آتا ہے، میرے گرنے کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے جس قدر وہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ روشنی کے اُس نقطہ کا حجم بڑھتا جاتا ہے
—— کہیں یہ ماہِ نخشب تو نہیں؟ روشنی ٹھنڈی ہے اور تیز ——
ایک جھٹکا لگا، حرکت ختم ہوگئی۔ میرا جسم ٹھہر گیا، آنکھیں کھل گئیں! سامنے ایک دیوار تھی اس دیوار میں ایک دریچہ تھا —— بند اس سربستہ دریچہ میں ایک چھوٹا سا گول سوراخ تھا، اُس سوراخ سے ایک تیز روشنی نکل رہی تھی۔ —— یکایک وہ سوراخ پھیلنے لگا وہ روشنی بھی پھیلنے لگی —— کسی نے اُٹھا کر مجھے اُس سوراخ کی طرف پھینکا —— ایک دھمکا ہوا، جیسے میں زمین پر گرا۔ روشنی اس قدر تیز تھی —— مگر گرم نہ تھی —— کہ آنکھیں بند ہوگئیں ——

"دم اُٹھ!" کسی نے تاتاری زبان میں کہا ——

"میں کہاں ہوں؟ یہ کیا جگہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"چاہِ نخشب ہے یہ، دم اُٹھ!" پھر آواز آئی۔

کوئی مجسم جاندار سامنے نہ تھا مگر آواز اس طرح آرہی تھی کہ گویا کوئی میرے سامنے کھڑا ہے۔

"چل" آواز آئی ——

اور میں بغیر جواب دیئے چل کھڑا ہوا، بغیر ارادہ اور خواہش کے —— مختار نہ تھا مجبور تھا۔ ——

اس سیاحت کی داستان تو بہت طویل ہے، مگر یوں سمجھ لیجیے، کہ جہاں میں پہنچا، وہ چاہ نخشب کی آبادی تھی، وہاں جو لوگ بستے ہیں وہ جسم اور گوشت و پوست نہیں رکھتے ——— ارواح ہیں ——— خالص اور مصفا ——— میرے لئے وہ مناظر عجیب تھے جو میں نے دیکھے ——— مکانات ——— ایسے ——— کہ معلوم نہیں کس چیز سے بنائے گئے تھے اینٹ، پتھر، بلور، کچھ بھی نہیں لیکن ایک دھندلی شکل اُن کی تھی جیسے دھواں! محرابیں اور ستون، اور دروازے نشستیں، دالان، حجرے، سب کی وہی صورت تھی جیسی ہمارے تمہارے مکانوں کی، لیکن اُن کی دیواروں کو انگلی لگائی تو گویا بھاپ یا دھویں یا کُھر کی چادر کو چھُو لیا ——— قطعاً غیر محسوس! وہاں کے باشندوں کی حالت یہ کہ آواز کے سوا کچھ نہ تھا۔ ——— جسم کی ساری پابندیوں سے آزاد ——— دن اور رات کا امتیاز نہ کچھ نہ تھا وہی ایک روشنی ہر وقت موجود تھی ——— وقت کا حساب بھی کچھ نہ تھا ——— روشنی کا منبع بھی مستور تھا یا ناپید تھا ———

میری رہنما وہی ایک آواز تھی جو کبھی شانہ بشانہ اور کبھی میرے آگے آگے چل رہی تھی، شہر کی سڑکیں، مکانوں کی طرح، ایک بجھا ہوا پھیلا ہوا غبار تھیں ——— میں پاؤں

دکھتا لیکن آواز نہ آتی تھی ـــــــــ

"یہ کیا مقام ہے جناب اور آپ کون ہیں؟"

جواب میں آواز آئی "چاہ نخشب ہے یہ اور ہم لوگ یہاں کے باشندے ہیں۔"

"انسان ہیں آپ؟" میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"ہاں!"

"جنات تو نہیں۔"

"نہیں۔"

"پھر آپ نظر کیوں نہیں آتے؟ یہ کیسی آبادی ہے کہ یہاں کوئی انسان نظر نہیں آتا؟"

"آؤ ـــــ اندر آؤ" آواز نے مجھے ایک دروازہ کی طرف بلایا۔ جس مکان میں میں داخل ہوا وہ بالکل خالی تھا ـــ خالی نظر آتا تھا۔

"بیٹھ جاؤ" آواز نے حکم دیا۔

آواز کرخت نہ تھی بہت نرم اور شیریں تھی۔ میں نے دیکھا کہ کرسی میز یا تخت کوئی چیز نہیں ہے سوائے اُس خالی فرش کے جس کو جس کو میں دیکھتا تھا مگر میرے پاؤں محسوس نہ کرتے تھے ــــ گویا بادل پر چل رہا ہوں۔

"بیٹھ جاؤ۔" آواز نے پھر کہا۔

میں بیٹھ گیا بغیر یہ سمجھے کہ کہاں بیٹھتا ہوں۔

"تم کہاں سے آئے ہو ؟"

"میں پاکستان کا رہنے والا ہوں، ہرات سے آ رہا ہوں اور سمرقند جانا چاہتا ہوں، یہ کیا طلسم ہے، جہاں آپ مجھے لے آئے ؟"

"طلسم نہیں ہے یہ ——— جو کچھ تم دیکھتے ہو انسانی عقل کا ارتقا ہے ——— تقریباً انتہائی ———"

"عجیب! لیکن آپ نظر کیوں نہیں آتے ۔؟"

"دس لاکھ آدمی اس آبادی میں رہتے ہیں، کوئی نظر نہیں آتا جو چیز نظر آنے والی ہے ——— یعنی مادہ ———۔ اس کو ہمنے اپنے وجود سے خارج کر دیا ہے۔ گوشت، پوست، جسم، ہم کچھ نہیں رکھتے، اس قسم کی ساری پابندیوں سے آزاد ہیں ———"

"پھر آپ کھاتے پیتے کیونکر ہیں ۔؟"

"ہم اس احتیاج سے کلیتہً آزاد ہیں۔ ضرورتیں اور خواہشیں انسان کی زندگی کو تلخ کرنے والی ہوتی ہیں ——— ہم نے ان سب سے اپنے وجود کو مستغنی کر لیا ہے ———"

"یہ کیسے ؟"

"یہ ایسے کہ ہم عقل کے فطرتی ارتقا کی تقریباً انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں ——— مادہ کثیف چیز ہے، ہمنے ہر قسم کی کثافت کو خارج کر کے اپنے وجود کو اتنا لطیف بنا لیا ہے کہ اب مادی خواہشیں ہماری زندگی کو تلخ نہیں کر سکتیں۔"

"مگر موت؟ موت کا کیا علاج کیا آپ نے؟"

"موت ——— عقل کی دسترس سے باہر ہے اور لا علاج

ہم بھی مرتے ہیں مگر ہمارا مرنا تمہارے مرنے سے مختلف ہے۔ تم کفن و دفن کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہو، تمہاری "مادیت" امراض کو اپنے اندر پرورش کرتی ہے ——— ہمارے لئے یہ صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی بیمار ہم نہیں ہوتے، جاں کنی کے شدائد سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں، وقت معینہ پر دفعتاً غائب ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی جیز ایسی نہیں جو بے جان ہو کر باقی رہ جائے ہم گویا فضائے بسیط میں گھل جاتے ہیں ——— سرایت کر جاتے ہیں"

"مگر کوئی شکل تو ہوگی آپ کے وجود کی؟"

"کوئی شکل نہیں ——— آواز ہے، نظر ہے، حرکت ہے، مگر مادی جسم نہیں ہے۔ ہزارہا برس کی علمی تحقیقات کا یہ نتیجہ ہے۔"

"اور یہ مکانات، یہ محرابیں، یہ دروازے!" میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"یہ سب غیر مادی ہیں، تم ان کو چھو کر محسوس نہیں کر سکتے ——— گارا، چونا، پتھر اور لکڑی، جو کچھ مادی تھا وہ سب خارج کر دیا گیا ——— یہ سب لطیف اجزا ہیں ——— غیر مادی، جن سے ہم عمارتیں بنا لیتے ہیں ———" "اور آپ کا چلنا پھرنا؟"

"تمہاری اصطلاح میں ہم چلتے پھرتے ہیں ———

ہماری نقل و حرکت ایسی ہے۔ جیسے آسمان کے سیاروں

کی بلکہ سیاروں کی نہیں ——— جیسے اُن کے نور کی ——— مگر ہمارے مقابلے ہیں وہ سیارے اور اُن کا نور بھی کثیف اور مادی ہے۔

"عجیب، عجیب! ——— اور وہ جادوگر؟ جو کنوئیں سے چاند نکالا کرتا تھا ———"

"ہم ہیں سے نہ تھا ——— تم ہیں سے تھا ——— اسی طرح ایک دن اتفاقیہ اس آبادی میں آگیا تھا ہمنے چلتے وقت وہ چاند اس کو تحفہ دیا تھا ——— مگر وہ اس تحفہ کی قدر نہ کر سکا ——— وہ ٹوٹا ہوا چاند قدیم اب بھی ہمارے کسی کارخانے میں پڑا ہوگا ———"

"کارخانہ؟ تو آپ کے کارخانے میں پڑا ہوگا"

"ہاں، کیوں نہیں ——— قسم قسم کے کارخانے ہیں ——— ہماری اولاد بھی کارخانوں ہی میں پیدا ہوتی ہے"

"یہ کیوں کر؟"

"ہم نے اس وقتِ ارادی کو جو اولاد پیدا کرتی ہے مشینوں کی شکل میں منتقل کر لیا ہے ——— عورت اور مرد کا امتیاز ہمارے یہاں اب باقی نہیں۔ مُلک میں اموات کا اندازہ کر کے جس قدر موتیں ہوتی ہیں اتنے ہی بچے کارخانوں میں بنائے جاتے ہیں اس لئے ہماری آبادی

نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے ـــــــــ"

"عورت اور اس کا حسن ـــــــــ"

"حسن بالکل مادی چیز ہے، شہوت تمامتر مادیت پر مشتمل ہے۔ یہ گوشت اور ہڈی کی خواہشیں، معدہ کی تحریکات ہیں ـــــ ہم ان سب سے بالاتر ہیں۔ نر اور مادہ کی تفریق کو ہم نے ختم کر دیا مگر فطرت کا منشا عقل کے ذریعہ سے بہرحال پورا کر لیتے ہیں ـ"

"حسن کے ساتھ شعر اور موسیقی ـــــــ یہ سب؟"

"شعریت اور موسیقی تم سے زیادہ ہم میں ہے۔ تمہاری دنیا کی یہی ایک چیز ہے جو خالصتاً لطیف ہے ـــــ اس ملک سے بہتر موسیقی تم کہیں نہیں پا سکتے ـــــ تم لوگوں نے موسیقی کی روح کو اپنی مادیت کے اندر مقید کر رکھا ہے، ہم نے اس کو آزاد کر دیا۔ ہماری ساری فضا موسیقی سے لبریز ہے۔ تم ساز کے بغیر موسیقی کا ایک سُر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ہم کرۂ ہوائی میں بغیر ساز کے بہتر سے بہتر راگ راگ پیدا کر لیتے ہیں ـــــ فضا میں موسیقی کی لطیف لہریں پھیلی ہوئی ہیں ـــــ"

"عجیب عجیب! میں حیران تھا کہ کیا کہوں ـــ" ہاں تو وہ چاند جادوگر بولا۔
"وہ تو محض ایک کھلونا تھا ـــــــــــ تم اس ملک کو بہت عجیب سمجھتے ہو مگر عجیب چیز یہاں کچھ بھی نہیں

——— ہم لوگ عجائب پرست نہیں ہیں ——— جادوگر کی خواہش تھی کہ تمہاری دنیا میں یہاں سے کوئی ایسی چیز لے جائے جو وہاں کے عجائب پرست لوگوں کو حیران کر دے۔ ہمارے ایک کاریگر نے یہ کھلونا بنا کر اس کو دے دیا۔ مگر یہ صنعتیں فضول اور بے نتیجہ ہیں ——— ہم اپنا وقت یوں ضائع نہیں کیا کرتے۔"

"کوئی بادشاہ ہے آپ کا۔؟"

"ہماری آبادی دس لاکھ ہے اور دس ہی لاکھ بادشاہ ہیں ہر متنفس بادشاہ ہے۔

"پھر ملک کا انتظام؟"

"انتظام کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بد انتظامی کا امکان ہو تو انتظام کیا جائے، ہم نے بدنظمی اور بد امنی کے اسباب ہی باقی نہ رکھے ——— پھر انتظام کی ضرورت کہاں؟ ——— بد انتظامی پیدا ہوتی ہے معدہ سے۔ غذا کے نتائج بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ خالص انسانیت کے لئے آنتوں کو بھرنے کے لئے اور آنتوں کے بھرے ہونے کی وجہ سے لوگ جرائم کرتے ہیں ——— سارے جھگڑے اسی مرکز سے پیدا ہوتے ہیں، ہم نے اس مرکز ہی کو ختم کر دیا!

"تو پھر گویا آپ کی زندگی بے مقصد ہے اور کوئی کام ہی نہیں جو آپ کریں۔؟"

"یہ صحیح نہیں، تم سمجھتے ہو کہ ہماری زندگی کا مقصد کچھ نہیں اور کام بھی کچھ نہیں —— مگر جو مقاصد تم لوگوں کے ہوتے ہیں اور جو کام تم کرتے رہتے ہو اس سے تو یہی بہتر ہے کہ کوئی کام اور مقصد نہ ہو —— اور مقصد اور کام ہمارے لئے بہت ہیں —— اتنے کہ ہم کو فرصت ہی نہیں ملتی ——"

"وہ کیا؟"

"انسانی عقل کا ارتقاء —— ہم بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ موت سے ادھر ہمارے لیے کوئی چیز مشکل نہیں، ہم نے خالص انسانیت کا صحیح معیار قایم کر لیا ہے —— البتہ موت ایک دیوار ہے سد سکندری ہے جس کے آگے ہم نہیں جا سکتے اور جانا بھی نہیں چاہتے —— ہمارے لیے جو حدود مقرر ہیں ان کے اندر ہم ترقی کر رہے ہیں —— ترقی کر چکے!! ——

میں حیران اور بد حواس ہو گیا —— وہم و گمان سے باہر یہ عالم! —— کبھی نہ دیکھا نہ سُنا ——

"آپ اس ہماری دُنیا میں ٹھہرنا چاہیں تو کچھ عرصہ ٹھہر سکتے ہیں —— لیکن کوئی چیز ایسی نہیں جس کو آپ دیکھ سکیں، کوئی منظر ایسا نہیں جس سے آپ لطف اندوز ہو سکیں۔

تاوقتیکہ آپ کی مادّی کثافت دور نہ ہو اور آپ ہمارے وجود کی لطیف فضا میں داخل ہو سکیں ـــــ اس کے لیئے آپ رضامند ہوں تو بہت عرصہ تک ہمارے معمل میں آپ کو رہنا ہوگا ـــــ"

"یہ میں نہیں چاہتا" میں نے گھبرا کر کہا۔

"میں اپنی دُنیا میں جانا چاہتا ہوں ـــــ مجھے میری دُنیا میں پہنچا دیجئے ـــــ"

مجھ پر ایک خوف طاری تھا، میں پسینہ میں تر تھا، میرے جسم میں رعشہ تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا حبس دوام کی سزا پانے والا ہوں ـــ

"ہم جانتے ہیں ـــ کثافت کے کیڑے کثافت سے نکلنا نہیں چاہتے اور نکالے جاتے ہیں تو اکثر مر جاتے ہیں ـــــ ـــــ ہمارے مورثِ اعلیٰ نے بہت بڑی قربانی کر کے بہت سی سختیاں برداشت کرنے کے بعد اس سے زندگی کا راز حاصل کیا تھا، ہماری کتنی ہی نسلیں غیر مکمل اور ناقص حالت میں گذر گئیں تب آج ہم ارتقا کے اِس درجہ پر پہنچے ہیں ـــ ـــــ تمہارے لئے بہت مشکل ہے

میں جانتا ہوں ـــــ"

میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میرے کان میں یہ آواز نہ آئے کہ اب تو جا نہیں سکتا! میں نے گھبرا کر کہا :-

"تو پھر مجھے پہنچا دیجئے !!"

"جا اے انسان ناقص ——— تو کیا سے کیا ہو جاتا اگر تو سمجھ سکتا لیکن تیری روح کو تیرا گوشت پوست زنگ کی طرح چپٹ گیا ہے ——— روح اور جسم دو الگ چیزیں تھیں — ایک اصل تھی اور ایک نقل ——— اصل اور نقل اس طرح مل گئے ہیں کہ اصل کو نقل سے جدا کرنا مشکل ہو گیا ہے ——! جا ——!!

"میں اُٹھ کھڑا ہوا ۔ میں نے کہا" مجھے بھی کوئی تحفہ ——— اس ملک کا ———"

دفعتاً یہ معلوم ہوا کہ کسی نے میرے دماغ میں کسی نے ایک گرم لوہے کی سلاخ رکھ دی ہے ——— بیتاب ہو گیا ۔ نزع کی سی حالت مجھ پر طاری تھی ———

"بے وقوف انسان ——— یہ تیرے لئے ہمارا تحفہ ہے ایک نشانی ہم نے تجھے دی ہے ، تو بے تاب اور بے چین رہے گا جب تک کہ تیرا جوہر لطیف مادیت کے بند لفافہ کو چاک کر کے نکل نہ جائے — آزاد نہ ہو جائے — تو ہمیشہ بے چین رہیگا تو ہماری دنیا کو بھول نہ سکے گا اور ایک دن پھر تو واپس آئیگا ——— جا ——"

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے دماغ کے اندر ایک تراقا ہوا اور کوئی چیز پھٹ گئی ، زنجیر کی کوئی کڑی تھی

جو ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گئی۔

سرائے کا بھٹیارا مجھے ڈھونڈتا ہوا کنوئیں کی طرف آیا۔ اُس نے دیکھا کہ میں چبوترہ پر پڑا ہوا ہوں ـــــ بے ہوش ہوں یا سو رہا ہوں ـــــ اُسی طرح مجھے سرائے میں لے گئے ـــــ صبح کو میں نے اپنے کو سرائے کی ایک کوٹھری میں پڑا ہوا پایا میں نے اپنی واردات کسی سے بیان نہیں کی لیکن میں سمرقند جانے کی بجائے ہرات کی طرف لوٹ آیا اور وہاں سے چند ہی روز ہوئے کہ وطن پہنچا ہوں ـــــ چاہ نخشب کی یاد دل میں چٹکیاں لے رہی ہے ـــــــــــ کوئی مجھے پھر بلا رہا ہے ـــــــــــ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے ـــــــــــ اس چہ بچّہ سے جس کا نام زندگی ہے نکل ـــــــــــ اے کیڑے! انسانیت کا دعوےٰ کر ـــــــــــ دعوےٰ کرنے کے قابل ہو جا ـــــــــــ

وہی انسانیت جو کہیں چاہِ نخشب کے جوار میں ہے

ماہِ نخشب چاہِ نخشب!

ماہ نخشب، چاہ نخشب!!! موت کے سمندر میں زندگی کا ایک سرسبز جزیرہ، جہاں نہ امروز ہے نہ

فردا! صحرائے عظیم ہیں وہ نخلستان جہاں نہ آندھیاں ہیں نہ بجلیاں! ——————————

—————— اگر جنت کا تخیل بھی کوئی حقیقت رکھتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آدمی زندگی کی کثافت سے محفوظ ہو جائے ——————

—————— سکونِ کامل ہو اور زندگی بے مقصود اور بے حساب ہو!!!

یہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ جو کوئی میری بات نہ سمجھے وہ نہ سمجھے مجھے پروا نہیں —————— اور جو کوئی کچھ سمجھے وہ ایک دفعہ چارۂ تخشب تک ضرور ہو آئے!!!